MASHWARA SERIES

URDU



چند لفظوں میں

کرشن چندر کا قلم کسی تعارف کا محتاج نہیں اور اس لئے یہ کہنا کہ لاثانی مصنف کے افسانوں کا یہ مجموعہ بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں ، بے جا نہ ہوگا ۔

یہ آپ کے محبوب ادیب کے جدید ترین افسانے ہیں ، ایسے موتی جنھیں کرشن چندر نے زندگی کی عمیق گہرائیوں سے نکال کر سطح ادب پر بکھیر دیا ہے ۔

یہ ایسی کہانیاں ہیں جن کے کرداروں کی ہنسی اور آنسوؤں میں شریک ہوئے بنا آپ رہ نہیں سکیں گے

مشورہ پاکٹ بکس میں شائع ہونے والے تمام کردار مقامات
و واقعات فرضی ہیں اور ان کا کسی شخص جگہ، واقعہ یا ادارے
سے کوئی تعلق نہیں ہے، کسی فرد مقام یا ادارے سے
مطابقت قطعی اتفاقیہ ہے اور اس کے لئے مصنف
یا پبلشرز کسی طرح کی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتے۔

عام فہم اردو زبان مشہور و معروف ادیبوں کے لاجواب
اور معرکۃ الآرا شاہکار نہایت ارزاں قیمت پر فروخت کرنے والا ادارہ

مشورہ بکڈپو۔ رام نگر۔ گاندھی نگر۔ پوسٹ بکس 1639 دہلی 6

کرشن چندر

کرشن چندر کے افسانے

ناشران
مشورہ بک ڈپو
رام نگر۔ گاندھی نگر۔ پوسٹ بکس 1639 دہلی

پہلا ایڈیشن ۔۔۔۔۔۔ سنہ ۱۹۶۰ء



ناشران

مشورہ بک ڈپو

رام نگر۔ گاندھی نگر۔ پوسٹ بکس 1639 دہلی 6

قیمت فی کتاب صرف ایک روپیہ

(جمعیۃ پریس دہلی)

۵

ایک خوشبو اُڑی سی

جب سے فرنچ پرفیومرز لمیٹڈ نے چرچ گیٹ میں فرانسیسی عطروں کی دوکان کھولی تھی، بمبئی کے فورٹ کے علاقے میں اس کی سیلز گرل کی دھوم مچ گئی تھی فرنچ پرفیومرز لمیٹڈ کا مالک بلونت رائے ایک ہندوستانی تھا۔ جو ایک عرصے سے پیرس میں ہندوستانی مٹھائیاں بیچتا تھا۔ وہیں پر اُس نے ایک فرانسیسی لڑکی سے شادی کی تھی۔ وہیں پر اُس کے پانچ لڑکے پیدا ہوئے تھے۔ پچیس برسوں کے بعد وہ اپنے وطن واپس لوٹ آیا تھا۔ اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ تو یہاں پر آکر بھی اُس کا ارادہ اپنے پُرانے پیشے کو جاری رکھنے کا تھا مگر اس کی بیوی مادام سوسنا نے اسے مشورہ دیا تھا کہ ہندوستان میں رہ کر ہندوستانی مٹھائیاں بیچنا غلط ہوگا۔ اگر وہ پیرس میں ہندوستانی مٹھائی بیچتا تھا تو اسی قاعدے سے اُسے ہندوستان میں فرانسیسی عطر بیچنا چاہیئے۔ مادام سوسنا تجارت کے اصول بہت اچھی طرح سے سمجھتی تھی اُسے افسوس تھا تو یہی تھا کہ اُس کی اولاد میں کوئی لڑکی نہ تھی جسے وہ عطر کی دوکان پر سیلز گرل کا کام سکھا دیتی۔ اب لڑکوں کا عطر بیچنا ایسا ہی ہے جیسے

بین کے آگے بھینس کا ناچنا.... اور وہ خود اپنی جوانی کا سرمایہ، اپنے شوہر اور بچوں میں لگا چکی تھی۔ بس یہی ایک سرمایہ ہے اس دنیا میں جو سرمائے دار کو واپس نہیں لوٹتا ہے۔ ورنہ ہمیشہ سود سمیت واپس لوٹتا ہے، بلونت رائے اور مادام سوسنا نے بجائے جمہوری اخبار میں سیلز گرل کے لئے اشتہار دیا تھا۔ خوش قسمتی سے انہیں بہت جلد ایک بہت اچھی لڑکی مل گئی۔ موہنی کراچی کی پیداوار تھی سیدھے سبھاؤ کی معصوم لڑکی تھی۔ نہ کوئی غمزہ نہ ادا۔ دو چوٹیاں شانوں پر بکھرائے ایک سلیٹی رنگ کی ساڑھی پہنے سیدھی کالج سے انٹرویو کے لئے آگئی تھی۔ موہنی کا باپ مر چکا تھا، ماں گٹھیا سے نیم اپاہج بن چکی تھی۔ اس کے دو چھوٹے چھوٹے بھائی تھے جو بالترتیب پانچویں اور ساتویں میں پڑھتے تھے، ایک اندھی خالہ تھی، گھر میں سب سے بڑی وہ تھی۔ اس لئے باپ کا جُوا اس کے کندھے پر آن پڑا تھا۔ اور وہ جیسے تیسے کر کے اُسے نباہ رہی تھی۔ صبح میں وہ کالج جاتی جو سات سے ساڑھے دس تک ہارن بی روڈ کے نکڑ پر واقع تھا۔ اور دفتروں میں کام کرنے والے لوگوں کی سہولت کے لئے کھولا گیا تھا۔ دن میں دو جگہ پارٹ ٹائم ٹائپسٹ کا کام کرتی تھی، حالات نامساعد آرزوئیں مجبور، دل بجھا بجھا سا۔ ایسا تو کوئی بھی نہیں ہے جس نے اپنے ویرانۂ ہستی میں دو چار نخلستان نہ سجا رکھے ہوں۔ مگر موہنی اپنی زندگی پر جس طرف نظر ڈالتی۔ کوسوں تک اسے ریت ہی ریت نظر آتی۔ کہیں کوئی پھول تو کیا گھاس کی پتی تک نظر نہ آتی تھی...... صرف اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں کبھی ایسے شفاف سے سائے لرزنے لگتے جیسے بہت دور کہیں خواب رو رہے ہوں صرف چند لمحوں میں اس کی شخصیت بے حد دلآویز ہو جاتی تھی۔ اس وقت اگر کوئی اُسے دیکھتا تو پتھر سے پتھر دل بھی پانی ہو جاتا

بگہ بمبئی میں نہ پتھر دل ہوتا ہے نہ نرم دل ہوتا ہے، بمبئی میں دل کی جگہ ایک کلاک لگا ہوتا ہے جو ہر وقت ٹِک ٹِک کرتا ہے۔ اب کلاک بڑی اچھی چیز ہے۔ بڑی کارآمد چیز ہے، مگر آپ کلاک سے محبت تو نہیں کر سکتے ۔۔۔۔۔

بلونت رائے موہنی کی لسورنی ہوئی صورت دیکھ کر اُسے واپس بھیجنے والا تھا۔ مگر نہ جانے کیسے سُوسِتا نے موہنی کی بھوری آنکھوں میں وہ شفاف سے سائے تیرتے ہوئے دیکھ لئے، اُس نے ہاتھ کے اشارے سے موہنی کو جاتے ہوئے روک لیا اور اسے اپنے پاس بُلا لیا۔

سُوسِتا حسن کا شدید احساس رکھتی تھی۔ اس نے اس موہنی کو ایک نگاہ ہی میں پسند کر لیا۔

یہ لانبے لانبے سنہری رسوں کی طرح بٹی ہوئی چوٹیاں کٹ جائیں اگر بال پھیل کر شانوں پر بکھر جائیں تو کیا ہو ؟

یہ سیدھی صف آرا پلکیں ذرا گھوم کر روژ سے دمکتے ہوئے رخساروں پر حجاب آمیز ادا سے بکھر جائیں تو کیا ہو ؟

یہ پھیکا گلابی غنچہ دہن اگر شافری کی لپ سٹک سے آشنا ہو جائے وہ لپ اسٹک جو لبوں پر جب گھومتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یاقوت شعلوں کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں ـــــ وہ لپ سٹک اگر ان ہونٹوں سے مس ہو جائے تو کیا ہو ؟

جھاگ ایسے ربڑ کی نئے فیشن کی انگیا ذرا اوپر کو اٹھتی ہوئی وہ بے باک اٹھان نہیں جیسے آجکل کی عورتیں فیشن کی معراج سمجھتی ہیں بلکہ دہ جھجکتی ہوئی متین سی اٹھان، جیسے کوئی کنواری ایک نگاہ اٹھا کے اوپر دیکھ لے ـــــ

کمر کسی کے اندر سے باندھی ہوئی ...... حالانکہ اس کی ضرورت نہ پڑے گی۔ اس کے چھریرے لانبے بدن کی کمر یقیناً فرانسیسی عطر کی طرح نازک ہوگی ......

نہیں، وہ اسے ساڑھی نہیں دے گی، وہ اسے فرانسیسی گون پہنائے گی۔ سائے اور گون اور سلیکس اور جینز (Jeans) اس سیلز گرل کے طرح طرح کے لباس ہوں گے، وہ اسے فرانسیسی عورتوں کے بہترین لباس دے گی، عطر کی طرح عورت کا لباس بھی بدلنا چاہئے۔ صبح میں کچھ اور سہ پہر میں کچھ اور شام میں کچھ اور .... وہ اُس کے لئے کم سے کم بیس لباس سلوائے گی!

مادام شوستانے چند لمحوں ہی میں سب سوچ لیا۔ اس نے بڑے پیار سے موہنی کو اپنے پاس بٹھالیا۔ اور بولی۔

"تمہارا پرابلم (Problem) کیا ہے؟ تم اتنی اداس اور اُجڑی اُجڑی کیوں ہو؟"

فرانسیسی عورت بہترین محبوبہ ہے لیکن اگر وہ ماں بننا چاہے تو اُس سے بہتر ماں کا تصور بھی نہیں ہو سکتا، اُس کی میٹھی شہد آگیں آواز کوشن کر موہنی پگھل گئی۔ روتے روتے اُس نے اپنی زندگی کی ساری داستان سنادی۔ داستان بھی تھی ہی کیا۔ چند منٹ میں ختم ہوگئی۔ "چار سو روپے میں تمہارا کام چل جائے گا۔" شوستانے اس کے سر پہ بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا!

"میڈم؟" موہنی حیرت اور خوشی سے تقریباً چیخ کر بولی۔ ..

"شوستا؟" بلونت رائے بھی حیرت سے چیخا۔ مگر اُس کی آواز میں خوشی بالکل نہ تھی۔

"پیچھے بیٹھو!" مادام نے اپنے شوہر کو ڈانٹ دیا۔ "تم نہیں جانتے یہاں ہم ہندوستانی مٹھائی نہیں بیچ رہے ہیں۔ چار سو روپیہ مہینہ بھی اس لڑکی کے لئے بہت کم ہے۔ تم اس کا پرابلم تو دیکھو۔"

"او بھیں!" بلونت رائے کسی زمانے میں جالندھر کا مشہور پہلوان ہوا کرتا تھا۔ اس کی شہرت کا راز یہ تھا کہ بڑے سے بڑے پہلوان سے ٹکر لینے کے لئے راضی ہو جاتا۔ مگر ہمیشہ ہارتا تھا۔ اور جب چاروں شانے چت کرتا تھا تو بڑی مایوسی سے چلا کر اپنے آپ سے کہتا تھا "او بھیں!"

وہ پیرس اپنے پہلوانی کے کرتب دکھانے گیا تھا۔ مگر وہاں اسے شوستانے چاروں شانے چت گرا لیا۔ جب سے اس نے کشتی چھوڑ کر ہندوستانی مٹھائی بیچنے کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔

شوستا نے موہنی سے پوچھا۔ "خوشبوؤں کے بارے میں تم کیا جانتی ہو؟"

"میں نے آج تک کبھی کوئی خوشبو نہیں لگائی ہے۔" موہنی نے ڈرتے ڈرتے اپنا جرم کیا۔

شوستا بے حد خوش ہو کر بولی "تب تو بہت اچھا ہے بہت جلدی سیکھ جاؤ گی، پڑھے طوطے کو پڑھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔"

"او بھیں!" بلونت رائے پھر بڑی مایوسی سے بولا۔ اسے صاف نظر آرہا تھا کہ اب تک اس نے جو کچھ ہندوستانی مٹھائی سے کمایا ہے اب وہ سب فرانسیسی عطر میں غارت ہو گا۔

"شٹ اپ!" شوستا اسے دھمکاتے ہوئے بولی بلونت رائے

فورا نٹ شٹ اپ ہوگیا۔

"میں دو ماہ کے لیے تم کو گھر پر ٹریننگ دوں گی" سوسنا موہنی سے بولی، دو ماہ کے بعد تم دوکان پر کام کرنے لگو گی، دوکان پر پہننے کے لیے کپڑے ہم دیں گے۔ لنچ کا خرچ ہمارا ہوگا۔ دوکان بند ہوتے ہی تم شام کے اسی لباس میں میرے گھر آؤ گی اور یہاں سے اپنا لباس تبدیل کر کے اپنے گھر جایا کرو گی۔

تمہارا گھر کہاں ہے؟

"کھوکھرا باد ٹانک آٹھ نمبر کی کھولی۔ ناگپاڑہ"، سوسنا نے اس کا ایڈریس لکھ لیا۔ ناگپاڑے کا نام سنتے ہی بلونت رائے کو ایسا محسوس ہوا جیسے بہت سی بدبوئیں اس کی ناک میں گھس آئی ہوں۔ مگر وہ چپ رہا۔ کیونکہ اسے اس کی بیوی نے شٹ اپ کر دیا تھا۔ اور وہ ایک وفادار خاوند تھا۔

سوسنا نے موہنی کے ہاتھ میں اپنا کارڈ دے کر کہا۔

"یہ ہمارے گھر کا پتہ ہے"

موہنی نے ایک نظر کارڈ پر ڈالی "

"گیارہ نمبر وارڈن روڈ"

اور پھر اس کارڈ کو اپنی انگیا میں ڈال کر چلی گئی۔

دو ماہ بعد جب چرچ گیٹ کے نکڑ پر روز اینڈ روز اینڈ روز کمپنی کی لنبل میں فرینچ پرفیومرس لمیٹڈ کی دوکان کھلی تو سارے علاقے میں فرانسیسی خوشبوؤں کی دھوم مچ گئی۔ کولابے سے، کف پریڈ سے

میرین ڈرائیو سے، وارڈن روڈ سے، کمبالاہل سے، مالا بار ہل سے جوق در جوق لوگ فرانسیسی عطر خریدنے کے لئے آنے لگے، بعض من چلے تو دن میں دو دو مرتبہ عطر خرید کے لئے جاتے تھے۔

اور موہنی!

موہنی کو اب کوئی پہچان نہ سکتا تھا کہ یہ وہی کمرشیل کالج میں پڑھنے والی بجھی بجھی سی سندھی لڑکی ہے، موہنی کے چمکتے ہوئے سنہرے بال تارِ عنکبوت کی طرح تاباں اس کے شعلے کی طرح ٹپکتے ہوئے ہونٹ اور اُن ہونٹوں کے اندر بے حد سپید اور متناسب دانت، اس کی ٹھوری ٹھوری چمکتی ہوئی شفاف آنکھیں۔ وہ چال سندھی عورت کا سارا وقار لئے ہوئے ہے، وہ آواز فرانسیسی عورت کا سارا اعتماد لئے ہوئے ہے، اس کے فرنچ گاؤن، اس کے خوبصورت پرس۔ اس کے ارد گرد ہیولوں کی طرح لپٹی ہوئی عطر بیز مہک، متمول ترین علاقوں کی فیشن ایبل عورتیں اس کے گاؤن دیکھنے آتی تھیں، آج اس نے کون سا گاؤن پہن رکھا ہے، کون سا پرس سنبھالے ہوئے ہے کونسی خوشبو لگا رکھی ہے؟ میک اپ کا انداز کیا ہے؟ عورتیں اسے دیکھکر پاگل ہونے لگتیں اور مرد پاگل ہو کر اسے دیکھتے......

اور موہنی کی زبان کیا چلتی تھی وہ کم گو متین ہندوستانی لڑکی اب ایک لمحہ چپ نہ رہتی، کیونکہ اسے مادام نے بتا دیا تھا کہ چپ رہیں تو تمہاری باتوں کی ساری خوشبو اڑ جائے گی۔ عطر بیچنا ہے۔ تو گاہک کو سر لحظہ باتوں میں اُلجھائے رکھو، ایک کے بعد دوسرا عطر پیش کرتی جاؤ۔ عورتیں پچاس عطروں میں ایک عطر انتخاب کرتی ہیں مردوں

کے لئے سارا زور صرف ایک عطر بیچنے میں لگا دو۔

جب درشن نے اُسے دیکھا تو وہ کونٹر پر ہی تب کھڑی ہائی سوسائٹی کی مشہور سوشلائٹ مس خورشید ابٹن والا کے سامنے عطر کی مختلف شیشیاں رکھے اس سے گفتگو میں مصروف تھی۔۔ ۔۔۔

"خوشبو کا راز اس بات ہی ہے مس ابٹن والا کہ صحیح خوشبو خریدی جائے جس کی شخصیت خریدنے والی کی خوشبو سے مطابقت کرتی ہو۔"

خوشبو کی بھی شخصیت ہوتی ہے؟ موہنی؟ - خورشید ابٹن والا ہنس کر بولیں۔

ہاں مس ابٹن والا ہر خوشبو کی اپنی شخصیت ہوتی ہے اپنی ایک صورت ہوتی ہے، اس کا قد ہوتا ہے، رنگ ہوتا ہے اب مثال کے طور پر گلاب کے عطر کو لے لو گلاب کی خوشبو کے ہونٹ، ذرا سونگھ کر دیکھئے نا۔۔۔۔۔ اس گلاب کی خوشبو کے ہونٹ کیسے سرخ اور شہد سے بھرے ہوئے۔۔۔۔۔ بالکل آپ کے ہونٹوں کی طرح۔ ۔۔۔ ہر وقت کسی نامعلوم جذبے سے تھرتھراتے ہوئے۔۔۔"

مس خورشید ابٹن والا بے اختیار خوش ہو کر ہنسیں۔

"یہ چنبیلی کی خوشبو دیکھئے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے کیسی کم عمر و نوخیز چھریرے بدن والی نازک کمر والی خوشبو ہے اپنے مستانہ خرام سے دلوں پر بجلیاں گراتی چلی جاتی ہے۔"

"یہ پیرس کی رات دراز قد۔ سیاہ گیسو پھیلائے ہوئے اپنے نرم گال آپ کے گالوں سے یوں لگا دیتی ہے کہ گال اور گیسو کے لمس

سے آپ کے جسم میں گدگدیوں کے بلبلے سے پھوٹنے لگتے ہیں۔

یہ جوجیسی کی کنواری خوشبو، پاکیزہ سمٹی سمٹائی جو رنگاہوں سے آپ کے دل پر حملہ کرتی ہوئی کبھی ایک قدم آگے بڑھتے ہوئی، کبھی ایک قدم پیچھے ہٹتی ہوئی، اس کی مہک ایک شرمیلی دوشیزہ کی طرح پرحجاب نظر آتی ہے۔

یہ سنگھراج کی خوشبو گوری گوری رنگت والی نکھری نکھری صبیح اور روشن خوشبو بالکل آپ کے چہرے کی طرح مس اپٹن والا اسے نہاکر ذرا سا جسم پر لگا لیجئے، ایسا معلوم ہوگا گویا اوشا بادلوں کے جھاگ سے دھل کر باہر نکل آئی ہے۔!۔۔۔۔

یہ صرف یہ کہ خوشبو کی اپنی شخصیت ہوتی ہے، اس کا اپنا لباس بھی ہوتا ہے جو احساس میں کبھی تو ریشم کی طرح سرسراتا ہے، کبھی نائیلان کی طرح پھسلتا ہے، کبھی شیفان کی طرح لپٹتا جاتا ہے۔ اسی لئے میڈم دنیا میں جو بھی سلیقہ شعار عورتیں ہیں ہمیشہ کسی عمدہ خوشبو کا سہارا لیتی ہیں، یوں کہنا چاہئیے کہ لباس کے حسن کی طرح خوشبو کا حسن بھی مستعار لے لیتی ہے جب ہینڈ سنٹ کے لئے خوشبو کا حسن عورت کے حسن پر چھا جاتا ہے اور مرد سمجھتا ہے کہ عورت حسین ہے حالانکہ صرف خوشبو حسین ہے۔!۔۔۔

یہ آخری چوٹ مادام شوستانے خاص طور پر موہنی کو رٹائی تھی عورتیں بڑی بر خود غلط ہوتی ہیں، ان کے حسن کی تعریف کرو ضرور کر وہ اس سے خوش ہوتی ہیں، مگر کہیں پر ان کے اندر ایک لمحے کے لئے احساس کمتری بھی پیدا کر دو کہ حسن کی چوٹ کھا کر وہ تمہارے عطر کو اپنے

اپنے حسن کے لیے ضروری خیال کریں - اور وہ تمہارا عطر کیوں خریدیں گی - عورت بڑی پریکٹیکل ہوتی ہے موہنی -!

مس اٹین والا دو خوشبوئیں خرید کر لے گئی، روز جس کے ہونٹ موہنی کے الفاظ میں - مس اٹین والا کے ہونٹوں سے مشابہت رکھتے ہیں (حالانکہ نہیں رکھتے تھے) اور سنگھراج .... جس کی رنگت خورشید اٹین والا کی رنگت سے ملتی جلتی تھی - ایک سو ستّر روپے کا بل ہوا - حالانکہ بھنڈی بازار والے عطر فروش بھی دونوں خوشبوئیں دس پندرہ روپے میں دے دیتے - وہ بھی کم بخت کیا عطر بیچتے تھے، لوہے کی ایک پتلی سی سلائی پر روئی کا پھاہا لگا کر عطر بیچتے تھے، جیسے عطر نہ بیچ رہے ہوں کانوں سے میل نکال رہے ہیں کن میلیے کہیں کے! ......

یہاں موہنی کی نازک نازک لانبی لانبی انگلیاں عطر لگاتی تھیں، درشن کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے دل کے ان کے سارے تار چھیڑ دیئے ہیں وہ موہنی کو بھونچکا دیکھتا ہی رہ گیا - اور جب مس اٹین والا کے چلے جانے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوئی -

فرمائیے، آپ کو کونسا عطر چاہیئے؟

تو وہ بے حد گڑبڑا گیا - وہ تو محض دیکھنے کے لئے اُسے دکان کے اندر آگیا تھا - بے اختیار اس کے مدہوش کر دینے والے حسن سے کھنچا ہوا اندر آگیا تھا - اب یہ لڑکی اس سے کیا پوچھ رہی تھی، وہ بے حد گڑبڑا کر بولا -

"جی؟ جیسے اسے کچھ نہ خریدنا ہو - موہنی کو ہو -

"کوئی عطر دکھاؤں یا روڈی کلون؟ ہم نے پیرس سے نئے روڈی کلون

منگائے ہیں یہ سپین کے وادیوں کے پھولوں کے اصلی روڈی کلون ہیں، یہ صبح کے وقت نہادھو کر استعمال کرنے والا روڈی کلون ..... یہ دوپہر کی گرمی کی حرارت دور کرنے والا روڈی کلون ..... یہ کام سے فارغ ہو کر چہل قدمی کیلئے جانے سے پہلے استعمال کرنے والا روڈی کلون ..... یہ رات کے ڈانس میں جانے سے پہلے برتنے والا روڈی کلون ..... مکمل سیٹ ایک سو گیارہ روپے کا ہے سپین کی وادیوں میں کھلنے والے پھولوں کا اصلی روڈی کلون.....

"جی جی ..... مجھے کچھ نہیں چاہئے" درشن نے شرما کر کہا- اور اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا -

"میں تو صرف ..... صرف آپ کو دیکھنے کے لئے آیا تھا- دفتر میں بہت لوگوں نے .....

موہنی نے حجاب آمیز نگاہوں سے اپنی پلکیں جھکالیں بالکل اسی طرح جس طرح اس موقعہ کے لئے ماما جی نے بتایا تھا، دوسری بار جب اس نے پلکیں اٹھائیں تو درشن وہاں سے جا چکا تھا -

موہنی کے دل کو ایک عجیب دھچکا سا لگا -

مرد تو بہت آتے تھے دکان پر- مگر ان میں سے بیشتر بے ایمان تھے، آتے تھے اسے دیکھنے کے لئے کے جاتے تھے عطر اور خوشبو اور روڈی کلون، میبزائن - شمپو اور کریم - مگر یہ کیسا لڑکا تھا شرما بھی گیا اور بے جھجک سب کچھ کہہ بھی گیا، پھر کچھ خرید کر بھی نہ لے گیا- شاید وہ کچھ خریدنے نہ آیا تھا، کچھ دینے آیا تھا- شام تک موہنی کو اپنا دل کچھ خالی خالی سا لگنے لگا - جیسے اس کی ساری دکان لوٹی جا چکی ہے ..... کسی نے اس کے دل کے دریچے میں جھانک کر وہاں کے سارے عطر چرا لئے ہیں -

اونہہ! موہنی نے اپنے سر کے بالوں کو جھٹکا دیا۔ مجھے اس طرح کی باتیں نہیں سوچنا چاہئیں، مادام نے اسے خبردار کر دیا تھا۔ سب کچھ ہوگا مگر عشق نہیں ہوگا۔ لوگ تمہیں گھومنے کے لئے بلائیں گے مگر تم کہیں نہیں جاؤ گی ۔۔۔ لوگ تمہیں پارٹیوں میں مدعو کریں گے، چائے کی دعوت دیں گے، ایک ذرا دو منٹ کا تخلیہ چاہیں گے مگر تم ہمیشہ انکار کر دو گی، کیونکہ تم عطر بیچنے والی ہو۔ عطر اور محبت میں بھی فرق ہے۔ عطر ذرا سی دیر کے لئے مہکتا ہے پھر اڑ جاتا ہے، محبت اگر ساتھ لپٹ جائے تو زندگی بھر ساتھ نہیں چھوڑتی۔ اگر عطر بیچنا چاہتی ہو تو محبت کے چکر میں مت پڑنا۔۔۔۔۔۔

شام کو ساڑھے چھ بجے مادام سوستنا کی گاڑی اسے لینے کے لئے دوکان کے باہر آ پہنچی۔ پہلے تو موہنی نے اندر جا کر باتھ روم میں اپنا میک اپ ٹھیک کیا بالوں کو سنوارا شام کا خوبصورت لباس پہننا بے حد ضروری تھا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ باہر شوقین مزاج نوجوانوں اور رئیس زادوں کی لمبی لمبی گاڑیاں کھڑی ہوں گی۔ سب اسے دیکھنے کے لئے کھڑے ہوں گے۔ اس وقت اسے دوکان سے ایک پراسرار شہزادی کی طرح حسین اور دور افتادہ بن کر نکلنا ہوگا وہ بڑی تمکنت سے باتھ روم سے باہر نکلی، بلونت رائے کو اس نے سر کی جنبش سے سلام کیا اور پھر پرس جھلاتی ہوئی باہر آ گئی۔ ڈرائیور نے سلوٹ مار کر اس کے لئے کار کا دروازہ کھولا تھا تماشائیوں کی نظریں اس پر گڑ گئیں، کچھ سیٹیاں بجیں، کچھ ہائے وائے ہوئی، کچھ چنگاریاں لپکیں، کچھ آہیں بھڑکیں۔ پھر گاڑی وارڈن روڈ کی جانب چلی گئی۔۔۔۔۔۔

بھیڑ میں ورشن بھی کہیں چھپا کھڑا تھا۔ موہنی کو اس لباس فاخرہ میں نکلتے

دیکھکر اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ کیسی غلطی کی اُس نے جو اس سیلز گرل کو دل دے بیٹھا۔؟
یہ تو جانے مالا بار ہل یا وارڈن روڈ کی کوئی شہزادی ہے جو کار میں بیٹھ کر آتی ہے۔ کار میں جاتی ہے، جس کے گاؤن پیرس سے سِل کے آتے ہیں جس کے بال تاج محل بنتے ہیں اور جس کا سنگار نیویارک کے میک اپ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، اس نے تو شاید شغل کے طور پر عطر بیچنے کا کام اختیار کر لیا ہے، اسے بھول جا اُلّو، آرام سے اپنی فرم میں ڈھائی سو روپے کی ملازمت کرتا جا اور اگر عشق کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو وہ تیرے دفتر میں مس ڈی سوزا کیا بُری ہے ڈیڑھ سو روپے ماہوار لیتی ہے، بار بار تیری میز پر آ کر جُھک جاتی ہے اور اپنا نیم عریاں سینہ دکھا کر چلی جاتی ہے، شفان کا خیال چھوڑ دے اپنی کاٹن کی فراک میں مست رہ۔

مگر رشن سے رہا نہیں گیا، دوسرے دن وہ پھر فرنچ پرفیومرز کی دوکان پر گیا۔ تیسرے دن بھی گیا۔ چوتھے دن بھی گیا، پانچویں دن بھی گیا۔ ہر روز وہ شیو کرنے کے بعد استعمال کرنے والی روڈی کلون دس روپے میں خرید لیتا تھا اور کچھ نہیں کہتا تھا، بس وہی ایک روڈی کلون خریدتا، اور خرید کر باہر چلا آتا، نہ وہ مسکراتا تھا، نہ کوئی بات کرتا تھا۔

چھٹے دن موہنی نے کہا۔ روڈی کلون کی کتنی شیشیاں خریدو گے؟

"پچیس؟"

"پچیس کیوں؟"

"بات یہ ہے" رشن نے اُسے نہایت سادگی سے سمجھاتے ہوئے کہا "میری تنخواہ ڈھائی سو روپے ہے، میں اس تنخواہ سے روڈی کلون کی صرف پچیس شیشیاں خرید سکتا ہوں، اس لئے میں ہر روز ایک شیشی خرید کے لے جاتا ہوں

پچیس دن تک خریدتا رہوں گا۔ پھر پانچ دن نہیں آؤں گا۔ اور اگلی پھر یکم کو آؤں گا۔ اور یکم سے پچیس تک آتا رہوں گا...... اور اسی طرح......"

"کتنے سال کا پلان ہے؟..... موہنی نے شوخی سے پوچھا.....

"کہہ نہیں سکتا۔ جب تک جیب ساتھ دے، یا قرضہ ملتا رہے یا کوئی دوسرا پارٹ ٹائم جاب JOB ملتا رہے۔..."

جب تین مہینے اسی طرح گزر گئے تو موہنی کو سخت وحشت سی ہونے لگی۔

"مگر یہ تو سخت حماقت ہے! مسٹر؟"

"ورشن میرا نام ہے۔" ورشن بولا۔ "میں جانتا ہوں یہ ایک حماقت ہے۔ کہاں تم وارڈن روڈ پر رہنے والی شہزادی، کہاں میں ایک معمولی فرم میں کام کرنے والا کلرک! تمہارا خیال ہے میں جانتا نہیں ہوں میں کیا کر رہا ہوں مجھے بڑی مصیبت اٹھانی پڑتی ہے، راتوں کو چار چار گھنٹے اکسٹرا ٹائپ کرنا پڑتا ہے، انگلیاں دکھ جاتی ہیں..... مگر....."

یکایک وہ چپ ہو گیا۔

موہنی کا دل دھڑکنے لگا۔ آہستہ سے بولی "مگر کیا؟"

"نہیں ذرا وہ میری روڈی کلون دے دو۔"

روڈی کلون لینے کو موہنی مڑ ہی رہی تھی کہ اتنے میں ایک گھوڑے کے چہرے اور گھوڑے سے دانتوں والی ایک انگریز عورت بڑی گھبرائی ہوئی سیاہ ماتمی لباس پہنے ہوئے داخل ہوئی۔ موہنی فوراً اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"مجھے خوشبو چاہیئے۔"

"کیسی مادام؟"

"کیسی بھی دید نہ - کوئی اچھی سی خوشبو - میں نے سنا ہے تمہاری دوکان سے بہتر خوشبو بمبئی میں کہیں نہیں ملتی ہے، اس لئے میں نے سوچا اس مصیبت میں تمہارے سوا اور کس کے پاس جاؤں"

"تھینک یو مادام — تھینک یو..... مجھے آپ کی مصیبت میں آپ سے بہت ہمدردی ہے، اور آپ کا یہ ماتمی لباس دیکھکر میں خود سوچ میں پڑ گئی ہوں کہ آپ کو کونسی خوشبو دوں — شاید آپ کا کوئی عزیز"

"عزیز نہیں" گھوڑا مارکہ انگریز عورت فیصلہ کن لہجہ میں بولی "میری زندگی کا سب سے عزیز، سب سے چہیتا، سب سے پیارا - مجھے داغ مفارقت دے گیا ہے - میرا ٹونی"

ٹونی؟ آپ کا شوہر؟

"گوڈ ہیونس (Good heavens) نو! ٹونی میرا کتا!"...

"اوہ معاف کرنا مادام... مجھ سے بھول ہوئی -

دراصل اتنے سوال کرنے کی اس لئے ضرورت پڑی کہ ماتمی خوشبوئیں بھی کئی طرح کی ہوتی ہیں، محبوب کے مرنے پر ایک خوشبو لگائی جاتی ہے کتے کے مرنے پر دوسری، شوہر کے مرنے پر تیسری، بچے کے مرنے پر چوتھی - ہمارے یہاں ماتمی خوشبوؤں کی الگ الگ قسمیں ہیں - آپ ..... یہ خوشبو لے جائیے، سٹونی ہارٹ!

"سٹونی ہارٹ"

"جی ہاں دیکھئے، اور اس کا نام بھی کس قدر آپ کے کتے سے ملتا جلتا ہے، ٹونی ہارٹ اور سٹونی ہارٹ میں کس قدر کم فرق ہے، معلوم ہوتا ہے یہ خوشبو صرف آپ کے کتے کے ماتم کے لئے بنائی گئی ہے ......"

سٹونی ہارٹ! واقعی انگریز عورت پرس کھولتے ہوئے بولی، واقعی وہ پتھر دل کتنا تھا۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔

انگریز عورت کے لہجے میں آنسوؤں کا ہلکا سا اشارہ تھا۔ پرس کھول کر بولی۔ کتنے پیسے ہوں گے۔؟

صرف ساٹھ روپے! موہنی نے بڑی عاجزی سے کہا۔

انگریز عورت ذرا متجسس ہو کر بولی۔ پھر خود ہی لہجہ بدل کر بولی۔ مگر تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہ خوشبو بہت عمدہ ہے بوجھل...... بوجھل اداس سی اور کچھ کھردری سی خوشبو، بالکل میرے ٹونی کے بھورے اور خشک بالوں کی طرح ...... میں اسی کو لے جاؤں گی اس سے مجھے اپنا ٹونی یاد آئے گا ـــــ تھینک یو ویری مچ!

ساٹھ روپے دے کر جب انگریز عورت چلی گئی تو موہنی نے معافی مانگتے ہوئے درشن کو روڈی کلون کی نئی شیشی لا دی

"ساری (Sorry) آپ کو انتظار کرنا پڑا۔

"نہیں۔ بلکہ مجھے تو زیادہ وقت مل گیا"

"موہنی خاموش کھڑی رہی......

"چلتے چلتے درشن نے کہا "گوڈ بائی سٹونی ہارٹ! اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔....

موہنی کا دل لرزنے لگا۔

نہیں۔ نہیں۔ میں عشق تو کر ہی نہیں سکتی۔ مجھے کوئی حق بھی نہیں ہے، اتنی اچھی چار سو کی نوکری مجھے کہاں ملے گی، ان چار سو روپیوں ہی سے میری ماں کا علاج ہو رہا ہے۔ بس اپنی اندھی خالہ کو پیسے بھیجتی

ہوں - میرے دونوں بھائی بہنوں کی تعلیم انگریزی سکول میں ہو سکتی ہے، مجھے یونہی رہنا ہے، کیا ہی اچھا ہوتا اگر روشن بھی دوسرے نوجوانوں کی طرح ہوتا جو اس کو دیکھنے کے لئے دوکان پر آتے تھے اور اس سے طرح طرح کے مذاق کرتے تھے شگفتہ مذاق، مخمل میں لپٹے ہوئے مذاق مگر ایسے مذاق جن کے اندر غلیظ خواہش کی تیز چھری چھپی رہتی تھی جس کی دھار کبھی کبھی باتیں کرتے ہوئے عیاں بھی ہو جاتی تھی -

امیر طبقے کے شہزادے، ملوں کے ہونے والے مالک ٹھیکے داروں کے سپوت، رشوت لینے والے افسروں کے صاحبزادے گلیمر (Glamour) کے ہالے میں دمکتے ہوئے ماہتاب کی طرح خوبصورت فلمی ہیرو جو ایک رات میں بیس ہزار پھونک سکتے تھے وہ سب اس کی اک نگاہ ناز کے متمنی تھے مگر صرف اک نگاہ ناز کے، وہ کوئی عمر بھر کا پیمان باندھنے کے لئے نہیں آتے تھے، صرف اک نگاہ ناز خریدنے کے لئے آتے تھے - جیسے وہ عطر خریدنے کے لئے آتے تھے اور عورت کی آب بھی اسی وقت تک ہے جب تک وہ اپنی عزت کی شیشی میں محفوظ ہے - عطر کی شیشی کھلی اور آب غائب - یہ مردوں کی دنیا ہے اس میں عورت اور عطر ہمیشہ بدلے جاتے ہیں - ماما نے اسی طرح اسے سمجھایا تھا -

مگر پھر بھی روشن اسے اس طرح کا نہیں لگتا تھا، کوئی اس کے دل کے اندر بولتا تھا اور کہتا تھا - یہ تو ایسا نہیں ہے، وہ تو کچھ کہتا بھی نہیں ہے کوئی مخمل میں لپٹا ہوا گندا مذاق بھی نہیں کرتا، اس کی آنکھوں میں کیسی شرافت ہے، کیسی وارفتگی ہے - دل و جان سے چاہنے کی کیسی

آرزو ہے، اُسے پریشان بالوں کی لٹ اُسے اس قدر پیاری کیوں معلوم ہوتی ہے۔ کیوں اُس کا جی چاہتا ہے کہ وہ اسے اپنے سینے سے لپٹا لے، دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر آنکھیں بند کر کے اسے اپنی چھاتی سے لگا لے... ہائے یہ کیسی کاہش ہے۔ جو میری جان کو کھائے جاتی ہے.... مگر نہیں۔ نہیں مجھے اس طرح سوچنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ تو مجھے آسمان پر اُڑنے والی شہزادی سمجھتا ہے، میں اُس کا سندر سپنا کیوں برباد کر دوں۔ اس نے تو مجھے ہمیشہ فرانسیسی گارڈن میں دیکھا ہے۔

خوشبوؤں میں لپٹا ہوا زرکار ریشمی جھلملاتے ہوئے بادام کی گاڑی میں دیکھا ہے، اُسے کیا معلوم میں ایک ہینڈ لوم کی معمولی ساڑھی پہننے والی لڑکی ہوں۔ ناگپاڑے کی ایک گندی چالی میں ایک بدبودار کوٹھری میں اپنے دو بھائیوں اور گٹھیا کی ماری ہوئی ماں کے ساتھ رہنے والی۔ جسے ہر ماہ سو روپے اپنی اندھی خالہ کو بھیجنا پڑتا ہے اگر اُسے حقیقت معلوم ہو جائے تو کیا وہ مجھ سے پریم کر سکے گا۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں، اچھا ہے یہ دھوکا یوں ہی رہے، مگر اس کا اس طرح سے اگر اپنے آپ کو لٹانا بھی تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ بالکل غلط ہے ــــ بالکل غلط ہے، اگر میں اُس سے پریم نہیں کر سکتی تو مجھے اُسے برباد بھی تو نہ کرنا چاہیئے، مجھے اُس سے ایسی سرد مہری کا سلوک کرنا چاہیئے۔ ایسا سلوک جس سے اس کے دل میں میرے لئے نفرت کی آگ بھڑک اُٹھے۔ وہ مجھ سے شدید نفرت کرنے لگے، مجھے ہمیشہ کے لئے بھول جائے، اور اگر یہ بھی کرے تو ایک بُری اور ناکارہ

بدمعاش آوارہ لڑکی کی طرح یاد کرے، ورنہ وہ تو اس دوکان پر آکر تباہ ہو جائے گا - یہ دوکان ہے محنت کرنے کی جگہ نہیں ہے!

جس دن موہنی نے یہ ارادہ کیا اُس دن وہ بے حد اُداس اور تھکی ہوئی دکھائی دیتی تھی اور مادام نے اُس کے زرد زرد اُڑے اُڑے چہرے کی رنگت کو دیکھ کر اس کی طرف اشارہ بھی کیا، مگر موہنی نے یہ کہہ کر ٹال دیا - اُسے آج بہت کام کرنا پڑا ہے گاہکی بہت زیادہ تھی اور وہ بے حد تھکی ہوئی تھی - گاؤن اُتار کے اس نے اپنی سادہ ہینڈ لوم کی ساڑھی پہن لی اور پُرانے سینڈل کھٹکھٹاتی ہوئی موہنی واز ڈن روڈ کے عالیشان فلیٹ سے اتر کر ایک بس میں سوار ہو کر ناگپاڑے چلی گئی

موہنی کے پلان کا شروع میں تو خاطر خواہ اثر نہ ہوا - درشن بھی بے حد ڈھیٹ تھا، مگر موہنی نے سوچ لیا تھا کہ وہ بھی ڈھٹائی کا جواب مکمل ڈھٹائی سے دے گی - یہ قصّہ اُس کی ہمّت کو چوپٹ کر رہا تھا اُس کے کام میں ہارج ہو رہا تھا، اُس کی راتوں کی نیند حرام کر رہا تھا - اب قصّے کو ختم ہونا چاہیئے جس قصّے کا کوئی خاطر خواہ انجام نظر میں نہ ہو، اُسے ڈھیل دینے سے کیا فائدہ ہے

اب درشن کو دیکھکر موہنی تیوری سی چڑھا لیتی وہ اس کے لئے روڈی کلون کی شیشی بل کاٹ کے الگ سے تیار رکھتی، درشن آتا ہی وہی اُس کے ہاتھ میں بل اور شیشی تھما دیتی اور تھینک یو کہہ کر دوسرے گاہک کی طرف مسکرا کے متوجہ ہو جاتی - اس پر بھی درشن باقاعدگی

سے آتا رہا۔ وہ کچھ کچھ سا گیا تھا۔ موہنی کی غیر معمولی سرد مہری سے
اُس کے دل کو چوٹ لگی مگر وہ پھر بھی آتا رہا۔
خیر ایک دن موہنی کو آخری حملہ کرنے کا موقعہ مل ہی گیا۔ اور
اس موقعہ کی وہ تلاش ہی میں تھی، اس روز گروپ کیپٹن لال کاکا
اس کے قریب کھڑا اس سے عطریات کے فن پر بحث کر رہا تھا۔
گروپ کیپٹن لال کاکا دوسری جنگ عظیم کا نامور ہوا باز تھا۔
وہ آرمی سے ریٹائر ہو چکا تھا اور ذرا سا لنگڑا کر چلتا تھا۔ چالیس
برس کی عمر میں بھی وہ بڑی مشکل سے تیس کا دکھائی دیتا تھا۔ اُس کا
گورا رنگ اُس کے گھومے ہوئے بال، مضبوط ٹھوڑی اور چھوٹی
چھوٹی پر وقار مونچھیں اُس کے چہرے کو عجیب وجاہت عطا کرتی تھیں
وہ بڑا باذکا اور سجیلا تھا اور ہائی سوسائٹی کی خوبصورت لڑکیوں
میں تائل کے نام سے مشہور تھا۔ لڑکیاں تو اُس کے ذرا سا لنگڑانے
پر بھی جان دیتی تھیں۔ بولتے بولتے اس کی زبان میں کسی وقت
جو ذرا سی لکنت پیدا ہوتی تھی اُسے بھی لڑکیاں بے حد پسند کرتی
تھیں۔ کیپٹن لال کاکا چار سال پیرس میں بھی رہ چکا تھا۔ اس لئے
اُسے فرانسیسی عطریات سے بڑی دلچسپی تھی۔ کیونکہ فرانسیسی لڑکیوں
کی نفسیات میں عطر کو بہت دخل ہوتا ہے اس لئے ہر سمجھدار نوجوان
کے لئے جو عورتوں میں مقبول ہونا چاہتا ہے اس کے لئے یہ بے حد
ضروری ہے کہ عطر کے بارے میں ہی تھوڑی سی واقفیت رکھتا ہو
گروپ کیپٹن لال کاکا اکثر فریچ پرفیومرز سے عطریات
خریدنے آیا کرتا تھا اور موہنی سے باتیں کرنے میں اُسے بڑا لطف آتا تھا۔

اسی وقت بھی وہ موہنی سے باتیں کر رہا تھا۔ جب درشن دوکان کے اندر داخل ہوا موہنی نے درشن کی طرف کوئی توجہ نہ کی وہ گروپ کیپٹن لال کاکا سے باتیں کرتی رہی۔

موہنی ہنس کر بولی۔ کیپٹن لال کاکا۔ عطر کا بھی ایک وقت ہوتا ہے، ایک ماحول ہوتا ہے، لیکن کچھ لوگ ہوتے ہیں جو نہ وقت دیکھتے ہیں نہ ماحول کا خیال کرتے ہیں "

درشن کا رنگ فق ہو گیا۔

گروپ کیپٹن لال کاکا نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے کہا مثال کے طور پر میں نے اس وقت جو خوشبو لگا رکھی ہے اس کے متعلق تم کیا کہو گی؟"

موہنی گروپ کیپٹن کے سینے کی طرف جھکی اور جھکی اس کے بال گروپ کیپٹن کی ٹھوڑی سے چھو گئے، درشن کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے کلیجے میں چھری بھونک دی، وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔

"میں تمہیں اس عطر کا نام تک بتا سکتی ہوں اور یہ بھی بتا سکتی ہوں کب تم نے اسے لگایا تھا"

"کب؟"

"تقریباً دو گھنٹے ہوئے ہیں۔

"درست!"

"اس عطر کا نام آخری بوسہ ہے!"

"گروپ کیپٹن ہنسا ___ ٹھیک کہتی ہو، مگر..." لہجہ بدل کر

دھیرے سے بولا — ابھی تو میں پہلے بوسے کی اُمید میں ہوں۔"

"لالی!" موہنی بڑے پیار سے اور بناوٹی غصّے سے گروپ کیپٹن لال کاکا کو جھڑک کر بولی۔

مگر درشن کو اس میں نہ بناوٹ دکھائی دی، نہ غصّہ، اسے صرف پیار ہی پیار نظر آیا — کیسی دمکتی ہوئی مسکراہٹ تھی موہنی کی جس پیار سے وہ گروپ کیپٹن لال کاکا کو دیکھ رہی تھی — اور اُس نے اسے 'لالی' کہا تھا۔

موہنی بولی "یہ بیڈروم کا عطر ہے، اسے لگا کر باہر نہیں گھوما کرتے۔"

"کیوں نہیں گھوم سکتے؟" گروپ کیپٹن نے پوچھا۔

"اگر تم بیڈروم کا پائجامہ سوٹ پہن کر باہر گھوم سکتے ہو۔ تو ضرور اس عطر کو لگا کر بھی باہر گھوم سکتے ہو۔ اگر تم پیرس میں ہوتے تو لوگ یقیناً تمہارا مذاق اُڑاتے۔ ....."

"تو مجھے اس وقت کونسا عطر لگانا چاہئیے؟"

"مِس!" درشن ذرا بے چینی سے بولا۔

"پلیز!" موہنی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے انتظار کرنے کو کہا اور پھر مسکرا کر لال سے باتیں کرنے لگی۔

"بتاؤ نا موہنی! ..... میں اس وقت ڈرائنگ روم جا رہا ہوں اور ہو سکتا ہے کہ بیڈروم بھی جانا پڑ جائے۔ ....."

"بے حد شریر ہو!" موہنی پھر بناوٹی غصّے سے بولی "میں تم کو ایک ایسا عطر دیتی ہوں جو ڈرائنگ روم اور بیڈروم دونوں جگہ

کام آسکتا ہے!"

"موہنی عطر تلاش کرنے لگی۔ گروپ کیپٹن بلند آواز سے بولا۔
تم نے ہمیشہ انکار کیا ہے، مگر اب میں انکار کا ایک لفظ بھی نہیں سنوں گا
کل میری سالگرہ ہے، تمہیں میری پارٹی میں آنا پڑے گا۔
اگر تم مجھے لینے آؤ گے تو میں تمہارے ساتھ چلوں گی "
"گروپ کیپٹن لال کا کا نے زور سے پُرمسرت سیٹی بجائی۔
درشن جلدی سے قدم اُٹھاتا ہوا دوکان سے باہر چلا گیا۔ موہنی
نے کنکھیوں سے اُسے باہر جاتا ہوا دیکھا۔
جب وہ عطر لے کر واپس آئی تو گروپ کیپٹن نے چلّا کر کہا۔
تمہارے چہرے کو کیا ہوا۔ اس قدر زرد پیلا ...."
موہنی نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا —— "مجھے چکر
آرہا ہے!"

اس کے بعد دو ماہ تک درشن کی صورت دکھائی نہیں دی، نہ وہ دوکان
پر آیا۔ نہ باہر کی بھیڑ میں کبھی دکھائی دیا۔ جہاں سے موہنی کے دل میں
ایک جھرنا سا پھوٹا تھا — وہاں پر موہنی نے بڑی سی پتھر کی ایک سِل
رکھدی اندر سے زخم رِستا رہے، رستا رہے۔ باہر سے کچھ نظر نہ آئے۔ البتہ
راتوں کو اب بھی اُسے نیند نہ آتی تھی اسے سلیپنگ پلز
(Sleeping Pills) لینے کی عادت پڑ گئی، محبوب کو واپس
بُلانے کی دوا تو کسی ڈاکٹر نے ایجاد نہیں کی۔ لیکن نیند کو تو دوا کے زور
پر بلایا جا سکتا ہے۔ یہی غنیمت ہے!

پھر ایک روز وہ آیا - اب وہ بے حد دُبلا ہو گیا تھا - کم سے کم موہنی نے درشن کو اس قدر بیمار اور دُبلا کبھی نہ دیکھا تھا، اُس کے کپڑے بھی اچھے نہ تھے، پتلون میں کریز نہ تھی، قمیص کے دو بٹن غائب تھے - آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کئی دن سے نہیں سویا ہے ڈاڑھی بھی بڑھی ہوئی تھی، مگر نہ جانے کیوں درشن کو دیکھکر موہنی کا دل اندر سے پگھلنے لگا - اُسے اُس کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی والا چہرہ بیحد دل کش معلوم ہوا - مگر وہ چپ سی حیران کھڑی کی کھڑی اُسے دیکھتی رہ گئی -

درشن نے کہا: "مجھے سٹونی ہارٹ کی ایک شیشی چاہیئے"

موہنی بولی: "کیا تمہارے ہاں کسی کی موت ہو گئی ہے!"

"نہیں - میری شادی ہونے والی ہے!"

موہنی کا دل ایک لمحے کے لئے رُک گیا پھر رُک کر زور زور سے دھڑکنے لگا - اُس کا سارا جسم لرزنے لگا - اس کے ہاتھ پاؤں اس کے قابو میں نہ تھے، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے، کس سے کہے - کیونکر کہے، بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ پر قابو پاکر چہرے پر ایک مصنوعی تبسم لاکر کہا -

"سٹونی ہارٹ تو ماتمی خوشبو ہے ــــ شادی کے لئے موزوں نہیں ہے"

"اس شادی کے لئے یہی موزوں ہے" درشن نے دھیرے سے کہا - وہاں ادھر میرے گھر پر - میرے گاؤں میں، میرے ماں باپ میرا انتظار کر رہے ہیں - میں نے ہاں کر دی ہے، آج رات کو جا رہا ہوں

درشن رُک رُک کر بولا۔ اُس کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔ اُس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔

موہنی نے کہا "میں تم کو ایک بہت عمدہ خوشبو تمہاری دلہن کے لئے دوں گی۔ جائے! (Joy)..........مسرت"! ......اپنی طرف سے تحفہ میں دوں گی.........

درشن نے کوئی جواب دیئے بغیر سٹونی ہارٹ عطر کے دام کونٹر پر رکھ دیئے۔ اب موہنی کے لئے کوئی راستہ باقی نہ رہا۔ اس نے سٹونی ہارٹ کی شیشی اُٹھا کر درشن کو دیدی۔ درشن نے شیشی اس طرح سے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لی جیسے موہنی سے اپنے جرم کی آخری سزا پا رہا ہو۔ شیشی لے کر وہ سر جھکائے دھیرے دھیرے باہر جانے لگا۔

مت جاؤ درشن! موہنی نے اپنے دل ہی دل میں کہا، اندھے، بے وقوف، احمق، کیا تم نہیں جانتے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں کیا تم صرف میرا فرنچ گاؤن دیکھتے ہو۔ وہ زخم نہیں دیکھتے جو میرے دل کے اندر ہی اندر رس رہا ہے...... میرے حالات دیکھو۔ میری مجبوری تو دیکھو...... مت جاؤ درشن میں ایک امیر شہزادی نہیں ہوں، تمہاری طرح ایک غریب لڑکی ہوں جس کی ایک بوڑھی ماں ہے، ایک اندھی خالہ ہے دو چھوٹے چھوٹے بھائی ہیں۔ جو ناگپاڑے میں ایک گندی چال میں رہتی ہے، درشن کیا تم تین سو روپیوں میں ہم سب کو نہیں سنبھال سکتے" ارے میں گھر کے سارے کپڑے دھو دوں گی، خود اپنے ہاتھ سے استری کروں گی، تمہارے

لئے کھانا پکاؤں گی ۔ اپنے ہاتھ سے تمہیں کھلاؤں گی، اور جب تم تھکے ہارے سو جاؤ گے تو تمہارے پاؤں دباؤں گی ۔ مجھے اپنے چرنوں سے لگا لو درشن ۔ میرے کپڑے فرانس کے ہیں لیکن میرا دل ہندوستانی عورت کا ہے ۔ ظالم مت جاؤ ۔ مجھ سے مت کچھ کہلواؤ ۔۔۔۔۔ میری صورت کو دیکھ لو، دن رات فائلیں پڑھنے والے درشن، کیا تم ایک غریب لڑکی کے چھوٹے سے چہرے کو نہیں پڑھ سکتے" ۔۔۔۔۔ مگر موہنی کچھ کہہ نہ سکی ۔ درشن دھیرے دھیرے دوکان سے باہر نکل گیا ۔

درشن کے چلے جانے کے بعد وہ یکایک چکرا کر فرش پر گر پڑی ۔

جب وہ ہوش میں آئی تو اس نے اپنے آپ کو وارڈن روڈ کے فلیٹ میں پایا ۔ مادام سوسنا ہر طرح سے اس کی دلداری میں مصروف رہی ۔ سوسنا بڑی گھاگ عورت تھی، اس نے موہنی سے پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی ۔ ہونت رائے گو خاموشی سے دوکان پر بل کاٹتا رہتا تھا ۔ لیکن دیکھتا سب کچھ تھا ۔ اس نے درشن کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور مادام اس وقت موہنی پر واری جا رہی تھیں ۔

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے موہنی میں سب کچھ سمجھتی ہوں ۔ مگر میری عزیز بچی" یہ تمہاری زندگی کا پہلا غم ہے، اسے تو کسی نہ کسی طرح پی لینا چاہئے ۔ اسی غم کی بنیاد پر تم زندگی کی مسرت تعمیر کر سکو گی، تمہیں میری بات سن کر اچنبھا ہوگا ۔ مگر یہ بالکل سچ ہے، اسی دل کو

چرکا کھاتے دو، کیونکہ تمہارے مسائل بہت بڑے اور اُلجھے ہوئے ہیں۔ تمہارے کہانی! تمہاری ماں!! شادی تو آخر میں ہر عورت کو کرنا ہے، مگر سوچ سمجھ کر۔ دل کے ہاتھوں لُٹ کر نہیں، دل پر قابو پا کر، پانچ چھ سال یہاں کام کر لو گی تو کچھ روپیہ بچا لو گی، پھر دھیرے دھیرے تمہاری بڑھتی ہوئی شہرت ایک دبے پا خوشبو کی طرح ہائی سوسائٹی میں پھیل جائے گی اور تمہیں ایک دن ایسا شوہر مل جائے گا جو مالدار بھی ہو اور تمہاری پسند کا بھی ہو۔ یہ دونوں چیزیں زندگی کے لئے انتہائی ضروری ہیں۔ میری ڈارلنگ — ! اس لئے اس غم کو سہہ لو۔ اس دنیا میں سچی مسرّت غم کی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے جس طرح سے ہر اچھی خوشبو کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں تھوڑی سی بدبو کے اجزاء بھی شامل ہوں۔

شاید تمہیں معلوم نہیں ہے میری بھولی بچّی کہ ہمارے فرانسیسی عطر ساز سو طرح کی خوشبوؤں کو ملا کر ایک خوشبو تیار کرتے ہیں۔ مگر ہر خوشبو کی بنیاد میں کسی نہ کسی بدبو کے اجزاء بھی شامل رہتے ہیں۔ اسی بدبو کی بنیاد پر عطر کی خوشبو مہکتی ہے.... یہ زندگی کا اصول ہے۔"

موہنی نے آرام کرسی پر لیٹے لیٹے سوچا۔ کیسا یہ زندگی کا اصول ہے، محبّت کا غم کھاؤ۔ دولت کا انتظار کرو، بھائیوں کو پالو اور جوانی کو کھو دو۔ طرح طرح کی خوشبوؤں کو حسن کی عشوہ طرازیوں میں لپیٹ کر لوگوں تک پہنچا دو۔ لیکن اگر تمہارے نتھنوں میں سے کہیں محبت کی اُڑی اُڑی سی خوشبو بھی آ جائے تو فوراً منہ پھیر لو۔ کیونکہ اس سے کسی کی تجوری پر زد پڑتی ہے..........

اور یکا یک موہنی کی سمجھ میں آ گیا کہ فورسٹ کے علاقے کی جنگلی خوشبوئیں ہیں

ان سب کی بنیاد ناگیا ٹنے کی بدتو پر ہے!

مگر جب یہ بات اُس کی سمجھ میں آئی، وہ چیز کا کھا چکی تھی۔ درشن جا چکا تھا۔

مادام نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا "میں اگلے ماہ سے تمہاری تنخواہ میں پچاس روپے کا اضافہ کر رہی ہوں۔"!

شام کو وہ گھر پہنچ گئی۔ اُس کی ماں کتنے دنوں سے اُسے فلم رام راج دکھانے پر اصرار کر رہی تھی، موہنی نے اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ ماں کو سینما دیکھنے کے لئے روانہ کر دیا۔۔ وہ آج شام چند گھنٹوں کے لئے بالکل اکیلی رہنا چاہتی تھی۔

جب اُس کے بھائی اور ماں چلے گئے تو اُس نے اپنے بستر کو ٹھیک کیا۔ بستر کے قریب کی کھڑکی کھول دی پرس کھول کر اُس میں سے جانے رے Harem عطر کی شیشی نکالی جو وہ درشن کی دُلہن کو تحفے میں دینا چاہتی تھی۔ پھر اُس نے ایک خط اپنی ماں کو لکھا۔ ایک درشن کو اُس کے آفس کے پتہ پر۔ پھر اُس نے سلیپنگ پلز (Sleeping Pills) کی شیشی کی ساری گولیاں اپنی ہتھیلی پر انڈیل لیں اور اُنہیں کھا کر بستر پر دراز ہو گئی۔

کھڑکی سے باہر میلی میلی چھتوں سے پرے آسمان تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ فضا میں چمنیوں کا دھواں اور غبار چہار سو پھیلا ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے پردوں کو ہلانے والی ہوا میں ایک بدبودار گھٹن اور سیلن تھی، گلیوں اور گھروں کا بڑھتا ہوا شور کھڑکی سے اندر آرہا تھا۔ کہیں پر بچے بھوک سے چلا رہے تھے، مائیں انہیں پیٹ رہی تھیں۔ شوہر غلیظ گالیاں بک رہے تھے

ایک بوڑھی عورت کب سے برابر کھانسے جا رہی تھی، اس کا بلغم بدہیئت اور ڈھیٹ زندگی کی طرح اس کے حلق میں پھنس گیا تھا اور کسی طرح سے نکلتا نہ تھا۔

موہنی کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں، گلیوں کا شور بہت دور چلا گیا۔ اس کی ماں، اس کے بھائی اور اس کی خالہ کے چہرے مدھم اور موہوم ہوتے گئے اور پھر ان چہروں کے اوپر درشن کا چہرہ بہت دور سے قریب۔ قریب سے قریب تر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اب یہ چہرہ بالکل اس کی آنکھوں کے اوپر آ گیا تھا۔ اس کے سارے احساس پر چھا گیا تھا۔ موہنی نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی، اب وہ درشن کے ہونٹوں کو اپنی آنکھوں کی پلکوں پر محسوس کر سکتی تھی ۔۔۔ تم آ گئے درشن، اب مرنا کتنا اچھا ہے۔ میں تو تم سے پیار کرتی رہی ہوں، اور کبھی تم سے کچھ کہہ بھی نہ سکی۔ میری زبان ہی نہ کھل سکی، کیونکہ جب تم آئے میں عطر کی شہزادی تھی، تمہارے اور میرے درمیان عطر بیچنے والا کونٹر تھا۔ اور میں تم سے کچھ کہہ نہ سکی ..... تم نے مجھے ہمیشہ غلط سمجھا اور میں تمہیں کبھی ٹھیک نہ سمجھ سکی۔ مجھے اپنی باہوں میں لے لو درشن؟ میں نے ویران لمحوں میں، سنسان دوپہروں میں، اندھیری راتوں میں ہمیشہ تمہاری باہوں کا سہارا ڈھونڈا ہے۔ میرے ارد گرد یہ خوشبو اس ظالم سٹونی ہارٹ کی خوشبو بکھیر دو۔ جہاں میں جا رہی ہوں وہاں تم تو نہ جا سکو گے مگر تمہاری یاد میرے ساتھ ایک عطر بن کر چلی جائے گی۔

موہنی نے بڑی مشکل سے اپنا ہاتھ تپائی کی طرف بڑھایا جہاں اس کا پرس رکھا ہوا تھا۔ پرس کھول کر ٹٹول کر اس میں سے اس نے سٹونی ہارٹ

کی شیشی نکالی وہ اُسے اپنے بستر پر چھڑکنا چاہتی تھی مگر اس کے ہاتھوں
میں اتنی طاقت نہ رہی تھی کہ وہ اُس شیشی کو کھول سکے اور ایک بار اُس
نے آنکھیں کھول کر شیشی کو کھولنا چاہا مگر اُس کی پلکیں فوراً ہی اس کے
رخساروں پر آگئیں اس کے ہاتھوں سے عطر کی شیشی گر کر فرش پر ٹوٹ
گئی اور دھیرے دھیرے عطر بہہ کر اڑنے لگا۔۔۔۔۔
گاڑی جانے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا اور ظلاری ڈی سوزا اپنی
آنکھوں کے آنسو پونچھ کر درشن سے کہہ رہی تھی ۔ سیّی فوکل ۔ تم نے اپنی
محبت کا اظہار تو اُس سے کیا ہوتا ۔؟
اس کی ضرورت نہ تھی ،، درشن اداسی سے بولا ۔ وہ سب جانتی
تھی اس نے مجھے ٹھکرا دیا ۔
،، کیسے تم یہ کہہ سکتے ہو؟ ظلاری ذرا غصّہ سے بولی ۔
، کیا تم نے اُس سے شادی کی درخواست کی تھی ؟
نہیں ۔ مگر کیا وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتی تھی ؟ درشن نے
چڑ کر کہا ۔
نانسنس ! فلاری انتہائی غصّہ سے بولی
،، تم نے اس سے پوچھا تو ہوتا ۔۔۔۔ اس کا انکار سننا
تو ہوتا ۔
لوگ تو پانچ پانچ برس تک عورت سے انکار
سن کر بھی ہاں کرا لیتے ہیں ۔ اور ایک تم ہو کہ تم نے باوجودیکہ
موہنی سے اپنی محبت کا اظہار بھی نہیں کیا اور اتنی جلدی
مایوس ہو گئے ۔

۔کوئی فائدہ نہ ہوتا فلاری!" درشن کندھا جھٹکا کر بولا۔ وہ امیر تھی میں غریب تھا۔ وہ وارڈن روڈ پر رہتی تھی، اپنی گاڑی میں بیٹھ کے دوکان پر آتی تھی، ہزاروں روپے کا گونا پہنتی تھی۔

" اوہ جاہل! جاہل!!" فلاری چلائی..... تم نے سب چوپٹ کر دیا۔ ارے بے وقوف وہ تو میری طرح غریب لڑکی ہے، مادام کی گاڑی میں آتی تھی، مادام کی گاڑی میں جاتی تھی، گون اس کے اپنے نہ تھے دکان کے تھے، وہ وارڈن روڈ پر نہیں رہتی ہے ناگپاڑے میں رہتی ہے ایک معمولی سی کھولی میں، اس کا ایڈریس مجھے معلوم ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہے؟"

فلاری نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ جس دن سے تم نے مجھے سینما لے جانا بند کر دیا۔ میری طرف پیار سے دیکھنا بند کر دیا کیا میں اتنا بھی معلوم نہ کرتی؟ گدھے! گدھے!!

فلاری نے اپنا پرس کھولا اور اس میں سے کاغذ کا ایک پرزہ نکال کر درشن کے ہاتھ میں دے کر کہا۔

"یہ اس کا پتہ ہے فوراً جا کر اس سے ملو" اس کے بعد فلاری روتے ہوئے وہاں سے بھاگ گئی۔

درشن تھوڑی دیر تک بھونچکا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ دفعتاً اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے کاغذ کے پرزے کو غور سے دیکھا اپنا بیگ اٹھایا اور سٹیشن سے باہر آکر ٹیکسی تلاش کرنے لگا۔

موہنی کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔

" موہنی: موہنی!!"

"دروازہ کسی نے نہ کھولا۔

"موہنی یہ میں ہوں درشن ...... دروازہ کھولو...... تم سے ایک ضروری کام ہے ......"

مگر دروازہ کسی نے نہ کھولا۔

درشن نے ذرا سا زور لگایا۔ دروازہ آپ ہی آپ کھل گیا۔ درشن ایک جھٹکے سے اندر آگیا اور اندر جاتے ہی ٹھٹھک کر رہ گیا۔

سامنے بستر پر تکیوں کا سہارا لئے موہنی مردہ پڑی تھی۔ تپائی پہ ایک خط درشن کے نام کا تھا، ایک تحفہ اُس کے دُلہن کے لئے تھا۔ عطر کی ایک شیشی فرش پر گرکر ٹوٹی پڑی تھی، اور ایک اُداس مخزوں اُڑی اُڑی سی خوشبو ساری فضا میں گھل رہی تھی ......"

"موہنی!" درشن رندھے ہوئے گلے سے صرف اتنا ہی کہہ سکا، چند لمحے تو وہ چُپ چاپ کھڑا موہنی کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا اکر موہنی کے بستر پر گر گیا۔ پھر اس نے موہنی کے دونوں پاؤں اپنے ماتھے پر لگا لئے پھر پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔

سٹونی ہارٹ!

— · — · — · — · —

گیت اور میں

میں نے لفافہ چاک کرکے خط کیا نکالا۔ گویا شمشیر بے دریغ کو بے نیام کیا صاف انکار بالکل صاف انکار... کہیں پر شبہے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ آجکل کی لڑکیاں بالکل اسی طرح انکار کرتی ہیں جس طرح آج سے دو ہزار برس پہلے کی لڑکیاں انکار کرتی تھیں۔ غریبی اور محبت کبھی ساتھ چلتے ہیں جو آج چلیں گے۔ میں نے خط کو بار بار پڑھا اور جب پڑھنے سے بھی تسلی نہ ہوئی سو خط کو سونگھا ظالم نے آج خط میں خوشبو بھی نہ لگائی تھی۔ اس سے پہلے کا ہر خط خوشبو میں بسا ہوتا تھا، آج تو ڈاکیہ بھی خط کا حلیہ دیکھ کر حیران تھا۔ شاید اسی لئے وہ جلدی سے مجھے خط دے کر بھاگ گیا تھا۔ ممکن ہے اسے کچھ شبہ ہو!

دراصل حماقت میری تھی۔ مجھے تبا نا ہی نہ چاہیئے تھا کہ میں اسقدر غریب ہوں، میں اس کی دبی دبی سسکیوں، ملتجی نگاہوں اور میٹھی میٹھی باتوں سے دھوکہ کھا گیا کہ عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے، مرد کی بدصورتی اس کا بڑھاپا، اس کی بدتمیزی جہالت، کور نگاہی تک اسے گوارا ہے مگر وہ اس کی غریبی برداشت نہیں کر سکتی۔ شادی سے پہلے تو کسی حالت میں برداشت

نہیں کر سکتی۔

اب میں اس خط کو کیا کروں؟ یہ میز اس قدر گندی کیوں ہے؟ یہ گلاس ابھی تک اس پر کیوں پڑا ہے؟ کلینڈر کا ورق کس نے اُلٹ دیا ہے؟ سیاہی چوس پر یہ کالے کالے دھبے کیسے ہیں؟ آسمان گدلا کیوں ہے؟ فضا میں گھٹن سی کیا ہے؟

میں نے خط کو اپنی مٹھی میں مسل کر کچلی کر دی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ کلینڈر کو اُٹھا کے زمین پر دے مارا۔ گلاس کو کھڑکی کے باہر پھینک دیا سیاہی چوس کو پھاڑ دیا، اور کتابوں کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر فرش پر ٹپک دیا اور خود کھڑکی میں کھڑا ہو کر خودکشی کے طریقوں پر غور کرنے لگا۔

سامنے بے کنار سمندر پھیلا ہوا تھا۔

یکایک میں نے سوچا۔ بڑی خطرناک بات ہے، مجھے اپنے ذہن کی ٹیری کو بدلنا چاہئے، میرے مرنے سے تو وہ اور بھی خوش ہوگی، اترا اترا کر اپنی سہیلیوں میں میرا ذکر کرے گی اور اپنے غریب مجبور اور بدنو خاوند پر رعب گانٹھے گی۔

نہیں۔ میں اُسے اس کا موقعہ نہ دوں گا۔ ہرگز نہ دوں گا۔

لہٰذا میں کھڑکی سے پلٹ کر اُس کونے میں گیا۔ جہاں گراموفون رکھا تھا جلدی سے جو ریکارڈ بھی سب سے پہلے میرے ہاتھ میں آیا میں نے اسے گراموفون پر چڑھا دیا۔ ریکارڈ پر سوئی رکھ دی اور خود واپس کھڑکی میں کھڑا ہو کر سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔

دھیرے دھیرے ریکارڈ بجنے لگا۔ دھیرے دھیرے گیت میرے

پاس آیا۔

"ہیلو" گیت نے ایک ادا کے خاص سے مجھے مخاطب کیا۔

"ہیلو" میں نے ذرا ترشروئی سے اسے جواب دیا۔

"تم کون ہو؟" گیت نے پوچھا۔

"میں ایک غریب ادیب ہوں" میں نے جواب دیا۔

"اور اس سے پوچھا" تم کون ہو؟

"تم جانتے نہیں ہو مجھے؟" گیت نے بڑی حیرت سے کہا۔

"میں لتا کیسکر کا مشہور گیت ہوں"

"آجا رے بلموا" یہ کہتے ہوئے گیت کی لے میں ذرا غرور سا آگیا۔

"ہو تو پھر کیا ہوا؟" میں نے اس کے غرور سے چڑ کر کہا۔

گیت نے فخر سے سینہ تان کر کہا" جانتے نہیں ہو؟ میں دنیا کا سب سے بڑا گیت ہوں، میرے دس لاکھ ریکارڈ فروخت ہو چکے ہیں۔ پچھلے چھ ماہ میں تمہاری کتنی کتابیں بکی ہیں۔ پچھلے چھ ماہ میں۔

صرف تین۔

گیت بڑی حقارت سے ہنسا اور اس کا نغمہ بلند ہوتا گیا۔ جیسے وہ آسمان کو چھو رہا ہو، اور سمندر کی طرح پھیل رہا ہو۔ پھر بڑی ادا سے اٹھلاتے ہوئے بولا۔

مجھ سے خوبصورت گیت اس دنیا میں کہیں نہیں ہوگا۔ میرے حسن کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا۔ میں اتنا بکتا ہوں اتنا بکتا ہوں کہ

میری رائیلٹی سے گیت گانے والی نے ایک کوٹھی کھڑی کر رکھی ہے۔ گیت لکھنے والے نے ایک گاڑی خریدی ہے ۔ سنگیت بنانے والے نے اپنی تیسری بیوی کو طلاق دیدی ہے ۔ ۔۔۔۔

میں نے سوئی ریکارڈ پر سے ہٹادی ۔

یکایک کمرے میں خاموشی چھاگئی ۔

اب وہاں پہ کوئی نہ تھا۔

کوئی آواز نہ تھی ۔ کوئی گیت نہ تھا ۔ کوئی نغمہ نہ تھا ۔

چند لمحوں کے سکوت کے بعد میں نے پھر سوئی ریکارڈ پر رکھدی دھیرے دھیرے پھر ریکارڈ بجنے لگا ۔ دھیرے دھیرے پھر گیت میرے پاس آیا ۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ لنگڑا کے چل رہا ہے۔

"ہیلو"... اس نے دھیمے سُروں میں کہا

"ہیلو" میں نے جواب دیا، اور منہ موڑ کر کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔ اور سمندر کی لہروں کو دیکھنے لگا ۔

تم نے مجھے بند کیوں کر دیا تھا ۔۔۔ ؟ گیت نے مخزوں لہجے میں دریافت کیا ۔

میں نے کہا ۔ یہ سمندر کا نغمہ تم سنتے ہو ؟ کیا تم اِس کی طرح لازوال ہو ؟

نہیں! میں تو صرف تین منٹ تک بج سکتا ہوں گیت نے تاسف سے کہا ۔

میں نے گیت سے کہا ۔ جب پہلے دن کائنات نے آنکھ کھولی تو یہ نغمہ یہاں موجود تھا، آگ میں، اور پانی میں، اور گردش میں، تین منٹ کے بعد

جب تم آنکھ بند کر لو گے تو یہ نغمہ پھر اسی طرح یہاں موجود ہوگا۔ ..... مگر تم نہ ہو گے۔ اور چند برسوں میں وہ کوٹھی بھی نہ ہوگی، وہ گاڑی بھی نہ ہوگی۔ صرف محبت کی آہیں باقی رہ جائیں گی۔ ..... ذرا سوچو تم کس بات پر اس قدر فخر کرتے ہو۔؟

تو کیا سمندر کی بیکراں ہستی کے سامنے ایک ذرّے کے چمکنے کا کوئی حق نہیں ہے! گیت نے برافروختہ ہو کے پوچھا۔ اور کیا یک اُس کی آواز میں بادلوں کی گھن گرج ..... اور رعد کی چمک شامل ہوگئی۔

کیوں نہیں ہے! میرے دوست! مگر اس قدر اترانے سے بھی کیا فائدہ؟ ۔ تم دس لاکھ بار بکے ہو۔ مگر کبھی کبھی ایک گیت ایسا بھی آتا ہے جو ایک بار بھی نہیں بکتا ۔ مگر تم سے زیادہ خوبصورت ہوتا ہے!

یہ جھوٹ ہے؟ ۔ کیا تم نے کبھی ایسا گیت دیکھا ہے یا سُنا ہے!

ہاں ایک بار میں نے ایک عورت کے ہونٹوں پر اس گیت کو دیکھا تھا۔ وہ ایک ماں تھی اور بھکارن تھی اور سڑک کے کنارے بیٹھی تھی ۔۔ وہ بھوکی تھی اور اُس کا بچہ بھوکا تھا اور رات گہری ہو چکی تھی اور روٹی کا ایک ٹکڑا اُسے میسر نہیں تھا اور وہ اپنے بچے کو لوری سے تھپک کر سُلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس لوری میں کیا نہیں تھا۔ کائنات کا سارا درد، ماں کی ساری مامتا! اور انسانی زندگی کی ساری چاہت گھُل گھُل کر آواز میں تبدیل ہو رہی تھی۔

جیسے ماں اپنے گلے سے نہیں اپنی بے دودھ چھاتیوں سے گا رہی ہو۔ کیا تم نے کبھی کسی گیت کو بچے کے دودھ میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے۔؟

نہیں!

میں نے اس رات دیکھا تھا۔ اور سمندر کے کنارے دیکھا تھا۔ اور یکا یک ہوا کا طوفان تھم گیا تھا اور سمندر شرم سے خاموش ہو گیا تھا۔ اور ناریل کے لہلہاتے ہوئے شور مچاتے ہوئے مور پنکھ ندامت سے سرنگوں ہو گئے تھے ۔ ساری کائنات چپ چاپ سر جھکائے اس بے کس بھوکی ماں کے قدموں میں کھڑی تھی جس نے اپنے بھوکے بچے کو دودھ کی ایک بوند پلائے بغیر ایک لوری سے سلا دیا تھا۔ میں نے وہ معجزہ اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ اس لوری کی کرب انگیز لے اب تک میرے کانوں میں گونجتی ہے اور تم مجھ سے کار کی، کوٹھی کی اور تیسری بیوی کے طلاق کی باتیں کرتے ہو۔

یکا یک میں کھڑکی سے مڑا۔ اگر گیت خاموش ہو چکا تھا۔ ریکارڈ بجکر چپ ہو گیا تھا۔ تین منٹ ختم ہو چکے تھے۔ میں نے پھر ریکارڈ پر سوئی رکھی۔ دھیرے دھیرے ریکارڈ بجنے لگا۔ دھیرے دھیرے وہی گیت میرے پاس آیا۔ مگر اس میں نخرا اور غرور نام کو نہ تھا۔ اب وہ ایک چھوٹا سا میٹھا گیت تھا دل کا ایک چھوٹا سا درد لئے ہوئے، رومان کی ایک ہلکی سی کسک لئے ہوئے محبت کے جگنو کی ایک ننھی سی روشنی لئے ہوئے اور وہ دھیرے دھیرے میرے دل میں اترنے لگا جیسے زلف رخسار پر اترتی ہے، جیسے چاندنی ساحل پر اترتی ہے جیسے سیپ سمندر کی تہہ میں اتر جاتی ہے اور منہ کھولکر محبت کے پہلے موتی کا انتظار کرتی ہے ـــــ میں سر جھکائے اپنی میز کے پاس چلا گیا، ہاتھ بڑھا کر میں نے ردی کی ٹوکری سے اس کے خط کو نکال لیا اور اسکی تہیں صاف کرتے ہوئے اسے اپنے کلیجے سے لگا لیا ـــــ

بھولا

پہلی بار جب میں نے گوردیال سنگھ کو دیکھا تو اُس کا سارا مُنہ سوجا ہوا تھا۔ اور اُس نے اپنی ڈھیلی پگڑی کے شملے سے اپنے منہ کو چھپا رکھا تھا۔ اور شملے سے اُوپر گھنی بھوؤں کے نیچے اس کی بڑی بڑی حیران آنکھیں درد سے کراہتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

ڈاڑھ کا درد ہے؟ میں نے اُس سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے اُس کا منہ کھول کر دیکھا۔ ڈاڑھ اپنی جگہ سے ہل چکی تھی اور ڈاڑھ کے ارد گرد سیاہ خون جم گیا تھا۔ اور مسوڑھے بھی سوجے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی اناڑی نے ڈاڑھ کو کھینچ کر نکالنے کی کوشش کی ہے۔

مجھ سے پہلے کس دندان ساز کے پاس گئے تھے۔؟ میں نے گوردیال سے پوچھا۔

گوردیال بولا۔ "سٹیشن کے باہر فٹ پاتھ پر ایک دانت والا

بیٹھتا ہے۔ وہ منتر پھونک کر دانت نکالتا ہے۔ بولتا تھا میرے
منتر سے ڈاڑھ میں ذرا بھی درد نہیں ہوگا۔ اور ڈاڑھ ایک ہی جھٹکے سے
نکل آئے گا۔ اور صرف آٹھ آنے لوں گا۔"

"پھر؟"

گوردیال جواب میں درد سے بلبلایا۔ اتنے لمبے چوڑے چھ فٹ کے جوان کا درد سے بلبلانا عجب مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ مگر دانت کا درد ہے ہی ایسی بُری چیز۔ محبت کا درد اور دانت کا درد دونوں بُری بلا ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ دانت کا درد محبت کے درد سے پھر بھی بھاری ہے۔ اگر کسی شخص کو بیک وقت محبت کا درد اور دانت کا درد لاحق ہو جائے تو وہ سب سے پہلے اپنے دندان ساز کے پاس جائے گا۔ بعد میں اپنی محبوبہ کے ہاں جائے گا! اگر دانت کا درد محبت کے درد سے سوا نہ ہوتا تو میں نے آج دندان سازی کا پیشہ چھوڑ کر عشق سازی کا مطب کھول لیا ہوتا۔ جہاں لوگ اپنے دل کا درد لے کر آتے اور اپنی عقل کی ڈاڑھیں نکلوا کے چلے جاتے!

گوردیال نے درد کی شدت سے اپنی دونوں آنکھیں اس زور سے بند کر لیں۔ جیسے درد اس کے دانت میں نہیں اُس کی آنکھ میں ہوتا ہو۔ اس نے پچکے ہوئے لہجے میں کہا "پہلے تو جی اُس نے ایک کالا دھاگا لے کر اُس پر ایک منتر پڑھا۔ پھر اس نے مجھ سے آٹھ آنے لے کر اپنی جیب میں ڈالے۔ پھر اس نے وہ کالا دھاگا لے کر میری ڈاڑھ کے سوراخ میں ڈال کر جو جھٹکا دیا ہے تو مجھے عرش کے تارے نظر آ گئے ... گوردیال کا سارا جسم اس تکلیف دہ لمحہ کی یاد سے لرز گیا۔

سب سے پہلے تو میں نے اُسے دانت کا درد دور کرنے کی دوا کھلائی چند منٹ گزر جانے کے بعد جب اُس کا درد غائب ہو گیا تو وہ کھسیاتے طریقے سے کچھ مسکرا کے کچھ خفا ہو کے بولا ۔

اب مجھے کیا معلوم تھا ڈاکٹر صاحب وہ آدمی پیسے لے کر بے ایمانی کرے گا ۔ پیسے لے کر تو آدمی کام کرتا ہے ۔ بے ایمانی نہیں کرتا ہے ۔!

" بمبئی میں کب سے ہو؟ میں نے اس سے پوچھا ۔

گوردیال نے انگلیوں پر گن کے کہا ۔ آج پورے پندرہ دن ہو گئے !"

" کیا کام کرتے ہو ؟

" کام ۔ گوردیال اپنی ڈاڑھی کھجاتے ہوئے بولا ۔

میں اُدھر بٹی خورد ضلع لدھیانہ میں کھیتی باڑی کرتا تھا اور ہاپ میرا ٹرک چلاتا تھا ۔ مگر اِدھر ماہ ہوئے میرا باپ مر گیا ۔ تو میں کھیتی باڑی اپنے چھوٹے بھائی کو سونپ کر باپ کا ٹرک لے کر بمبئی آ گیا ۔ سنا تھا یہاں بمبئی میں بہت کام ملتا ہے "

" پھر ملا ؟

" میونسپلٹی میں ٹنڈر بھر دیا ہے جی ۔ پتھر ڈھونے کا ۔ اب ٹنڈر پاس ہو جائے تو کچھ پتہ چلے ، ابھی تو میرے پاس کوئی گراج بھی نہیں ہے اور رہنے کی کوئی جگہ بھی نہیں ہے ، ادھر آپ کی بغل والی روڈ پر سردار بھگتا سنگھ فلوٹ ماسٹر جو رہتے ہیں ۔ وہ ہمارے لدھیانے کے ہیں میں نے اُن کے گھر کے باہر سڑک پر ٹرک کھڑا کر دیا ہے اور رات کو وہیں

ٹرک میں سوجاتا ہوں، دن بھر میونسپلٹی کے دفتر کے چکر کاٹتا ہوں۔ مگر ابھی تو ٹنڈر پاس نہیں ہوا۔ واہگورو کی کرپا ہوگی تو ہوجائے گی۔
نیچے کی منزل میں میرا گراج خالی تھا۔ کیونکہ میرے پاس کوئی موٹر گاڑی نہ تھی۔ جب میں تقسیم کے بعد بمبئی آیا تو پارسی مالکن نے مجھے اوپر کی منزل میں سے دو کمرے دے دیئے اور نیچے ایک گراج۔ مگر گراج خالی ہی رہا۔ لاہور سے اکھڑنے کے بعد حالات کبھی اتنے نہ سدھر سکے کہ گاڑی لے سکوں۔ اس لئے اب سوچا کیوں نہ گراج کرائے پر دے دوں۔؟

میں نے گوردیال سنگھ سے کہا " گراج تو میرے پاس ایک ہے اور خالی بھی ہے "

کیا کرایہ ہوگا؟

" ساٹھ روپے ہوگا!"

ساٹھ روپے یقیناً زیادہ کرایہ تھا۔ مگر میں نے سوچا میں ساٹھ کہوں گا تو کہیں تیس چالیس میں فیصلہ ہوگا۔ مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب گوردیال سنگھ نے مجھ سے کسی طرح کا بھاؤ تاؤ نہ کیا۔ اس نے فی الفور جیب سے ساٹھ روپے نکال کے مجھے دیدئے اور بولا۔ میں آج شام ہی کو ٹرک لے کر آجاؤں گا۔ اور اگر آپ اجازت دیں تو خود بھی اس گراج میں رہ لوں گا۔

" مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے ـــــ! میں نے گوردیال سے کہا۔

جب گوردیال چلا گیا تو میں نے مڑ کر کمپونڈر سے کہا " یہ بے چارا

گوردیال سنگھ بھی کتنا بھولا ہے، اسے زندگی کا کچھ پتہ ہی نہیں!

اس واقعہ کے چھ سات روز بعد، گوردیال میرے پاس مٹھائی لے کر آیا اور کہنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب میرا ٹنڈر پاس ہو گیا ہے، آپ کے گھر آنا تو مجھے بہت پھلا جی!

پھلا جی؟" میں نے گوردیال سے استفسار کرتے ہوئے کہا "کیسے تمہارا یہ ٹنڈر منظور ہو گیا۔ میونسپلٹی میں تمہاری کوئی جان پہچان ہو گی ـــ؟

"نہیں ڈاکٹر صاحب؟ اپنی تو کوئی شناکھت نہ تھی۔ مگر میونسپلٹی والوں نے بتایا کہ میرا ٹنڈر سب سے کم پیسے کا تھا اس لئے مجھے مل گیا جی۔ اور میں نے بھی ڈاکٹر صاحب خوب سوچ سمجھ کر ٹنڈر بھرا تھا، آنے جانے کے پیٹرول کا خرچہ لگا لیا، کلینر کی تنخواہ اور اپنا روز کا خرچہ اور تھوڑے سے مرمت کے پیسے، اور مجھے کیا چاہئے ڈاکٹر صاحب؟ باقی اپنے ہاتھ کی محنت ہے جتنی محنت کروں گا اتنے پیسے بنا لوں گا"

اس نے لڈو توڑ کر میرے منہ میں ڈال دیا۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔

"مبارک ہو گوردیال سنگھ"

گوردیال سنگھ خوش ہو کر بولا۔ واہگورو کی کرپا سے میں کل سے پتھر کی کھان سے پتھر ڈھونا شروع کر دوں گا"

یہ کہہ کر وہ کچھ یاد کر کے رو سے ہنسا۔

"میں نے پوچھا، کیا بات ہے گوردیال؟"

وہ بولا "جب میرا انٹر پاس ہوگیا تو انجنیر نے مجھے بدھائی دی۔ اور بولا۔ گوردیال میں تم کو اپنا آدمی دیتا ہوں۔ وہ تم کو کواری دکھا دے گا۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "کیسی کواری؟ انجنیر صاحب۔ میں تو یہاں پتھر ڈھونے آیا ہوں۔ شادی کرنے نہیں آیا۔ ہمارے پنجاب میں" گوردیال نے تشریح کرتے ہوئے کہا "کواری تو اس لڑکی کو کہتے ہیں جس کی شادی نہ ہوئی ہو۔ اب مجھے کیا معلوم تھا" گوردیال نے ہنس کر اپنے سپید اور بے حد متناسب دانت دکھلاتے ہوئے کہا۔ بمبئی میں کواری لڑکی کو نہیں کہتے، پتھر کی کھان کو کہتے ہیں! کواری؟ ہلے۔۔۔۔ ہلے!!

گوردیال زور سے ہنسا۔ پھر اپنی ڈھیلی پگڑی اپنے سر پر ٹھیک کرتا ہوا چلا گیا۔ میں نے اپنے کمپونڈر سے کہا۔

یہ ہمارا گوردیال بھی کتنا بھولا ہے ۔۔۔ اسے زندگی کا کچھ پتہ ہی نہیں۔!

۲

اسی دن سہ پہر میں جب میں ایک مریض کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا اور لکڑی کا زینہ اتر کے نیچے گراج کے سامنے سے گزرنے لگا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گوردیال کا ٹرک گراج سے باہر کھڑا ہے اور گوردیال اپنی پگڑی اتارے ہوئے ایک میلی قمیص کے نیچے ایک میلا کچھا پہنے ہوئے جس کا ازار بند گھٹنوں تک لٹک رہا ہے ایک لوہے کے ڈرام کو اپنے سامنے رکھے ہوئے اپنے ٹرک کو پانی سے صاف کر رہا ہے۔

کواری نہیں گئے ۔؟

گوردیال نے میری طرف مڑ کر دیکھا ۔ پھر اُس نے ٹرک صاف کرنے والا میلا چیتھڑا لوہے کے ڈرم میں زور سے پھینک کر کہا " گیا تھا؟

" پھر کیا ہوا؟

" ٹنڈر تا منظور ہو گیا؟

" وہ کیسے؟

گوردیال نے جلدی سے اپنا ازار بند گچھے میں اُڑس لیا ۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا ۔ میں کواری میں گیا ۔ وہاں سے پتھر لاد کر ٹرک بھر لیا اور جہاں پر سڑک کی مرمت ہو رہی تھی ۔ وہاں جا کر ٹرک خالی کر دیا ۔ اور سیر (Overseer) سے پرچہ لیا ۔ اور پرچہ لے کر انجنیر کے پاس میونسپلٹی کے دفتر پہنچا ۔ انجنیر نے میرے ہاتھ میں ایک رسید دے کر کہا یہ دس پھیروں کی رسید ہے ۔ یہ رسید لے کر اکاؤنٹنٹ کے پاس جاؤ اور اُس سے دس پھیروں کے پیسے لے لو میں نے کہا ۔ مگر میں نے دس پھیرے نہیں لگائے ابھی ایک ہی پھیرا لگایا ہے ، انجنیر صاحب آپ کو غلطی ہو رہی ہے ۔

وہ بولا ۔ وہ سب ٹھیک ہے دس پھیروں کی رسید میں پانچ پھیروں کے پیسے میرے ہیں ۔ پانچ تمہارے سمجھ گئے ؟

میں سمجھ گیا ۔ مگر سمجھ کر بھی کچھ نہ سمجھا ۔ میں نے رسید اس کے منہ پر دے ماری اور بولا ۔

اب ہمارا ملک آزاد ہو چکا ہے انجنیر صاحب ، اب یہ بے ایمانی نہیں چلے گی ۔ اب نہ میں حرام کا پیسہ خود کھاؤں گا نہ تم کو کھانے دوں گا ۔!

وہ بولا ــــ تو جاؤ گھر جا کر بیٹھو ۔ تمہارا ٹنڈر نا منظور!
گوردیال نے میری طرف پیٹھ کر لی اور لوہے کے ڈرم سے گیلا چیتھڑا نکال کر زور زور سے اُسے اپنے ٹرک پر رگڑنے لگا ۔
تھوڑی دیر تک تو میں چپ رہا پھر آہستہ سے بولا ۔
اب تم کیا کرو گے گوردیال ؟
گوردیال بجلی کی سی تیزی سے میری طرف مُڑا ۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے ، وہ اپنے بازوؤں کو نچاتے ہوئے بولا ۔ میں جوان ہوں ، محنت کر سکتا ہوں ۔ میرا ٹرک عمدہ ہے مجھے مالک پر بھروسہ ہے مجھے کہیں نہ کہیں ایمانداری کا کام مل جائے گا ۔ مگر یہ بے ایمانی مجھ سے نہ ہو گی ڈاکٹر صاحب ! میں حرام کا پیسہ نہیں کھاؤں گا ۔ !
میں نے آہستہ سے سر جھکا لیا اور چپ چاپ اپنا مریض دیکھنے کے لئے آگے بڑھ گیا ۔

چار پانچ روز کے بعد گوردیال سنگھ پھر میرے پاس آیا اُس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا اور وہ اوپر میرے مطلب میں آ کر سب کو مٹھائی بانٹنے لگا ۔ آج اُس کے ساتھ اس کا کلینر بچتر سنگھ بھی تھا ۔ بچتر سنگھ بھی گوردیال سنگھ کی طرح چھ فٹ کا اونچا جوان تھا ۔ مگر عمر میں گوردیال سنگھ سے کم ، گول گول آنکھیں شرارت سے چمکتی ہوئی اُس نے اپنی ڈاڑھی کس کے باندھ رکھی تھی اور اس کی پگڑی بھی کسی ہوئی تھی اور دونوں بہت خوش نظر آ رہے تھے ۔

میں نے بیڑا کھاتے ہوئے گوردیال سے پوچھا۔

"کام مل گیا؟"

"ہاں! ھگوروکی کرپا سے بڑا اچھا کام ملا ہے پریمیر کمپنی جو لوہے کے کباڑ کا کام کرتی ہے، اُس کا ٹوٹا پھوٹا لوہا احمد آباد سے یہاں لانا ہوگا اور یہاں سے ردّی بھر کے احمد آباد لے جاؤں گا۔ میرا دو ٹن کا ٹرک ہے، دونوں طرف سے اچھی کمائی ہو جائے گی۔

اس واقعہ کے چار یا پانچ روز بعد تک نہ میں نے گوردیال کو دیکھا نہ اس کے ٹرک کو میں نے سمجھا دونوں احمد آباد کے پھیروں میں مصروف ہوں گے، چار روز کے بعد مجھے گوردیال اور اس کا ٹرک اور اس کا کلینر بچتر سنگھ گراج کے باہر نظر آئے مگر کچھ بجھے سے کچھ پریشان سے۔ کسی گہری سوچ میں غلطاں، دونوں ٹرک کے باہر مڈ گارڈ پر بیٹھے ہوئے ایک میلی سی کاپی پر اپنا حساب جوڑ رہے تھے!

"کمائی کا حساب کر رہے ہو؟" میں نے خوش ہو کر کہا۔ گوردیال نے کمائی کے کرنے والے کو ایک موٹی سی گالی دی۔ میں دو قدم حیرت سے پیچھے ہٹ گیا۔ یہ پہلی بار تھی جب میں نے گوردیال کے منہ سے ایسی گالی سُن رہا تھا۔ اُسے سُن کر میں چوکنا ہو گیا۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ میرے پوچھنے پر گوردیال نے بتایا۔

میرا ٹرک دو ٹن کا ہے لیکن آپ جانتے ہیں اوورلوڈ کرنا قانون کے خلاف ہے، میں نے یہی سوچ کر ٹرک میں پونے دو ٹن کی ردّی بھری اور اُسے لے کر احمد آباد روانہ ہو گیا، راستے میں شوورت کا ناکہ آتا ہے اور دوسرے ناکے بھی آتے ہیں جہاں مال اور اس کا وزن

چیک کیا جاتا ہے۔ پہلے ناکے پر چیک کرنے والے بابو نے میرا لیسنس دیکھا۔ گاڑی کا نمبر دیکھا۔ دوسرے کاغذ دیکھے۔ وزن دیکھا ٹرک میں لدا ہوا سامان دیکھا جب سب دیکھ چکا تو بولا ۔ سات روپے نکالو۔ میں نے کہا۔ کس بات کے سات روپے، وہ بابو میری طرف حیرت سے دیکھنے لگا، پھر اس بابو کے ساتھ جو آدمی تھا۔ وہ مجھے ذرا پرے لے جا کر بولا۔ شاید پہلی بار آئے ہو۔ تم کو معلوم نہیں ہے۔ یہاں ہر ناکے پر ریٹ بندھا ہوا ہے۔ کسی ناکے کا سات روپے ہے کسی کا دس روپے ہے سب جگہ دینا پڑتا ہے سب لوگ دیتے ہیں۔

میں نے کہا۔ مگر یہ تو رشوت ہے!

وہ بولا۔ یہ رشوت نہیں ہے۔ ناکے کا بھتہ ہے۔

میں نے کہا میں نے اور لوڈ کیا ہو، میرا لائسنس غلط ہو، کوئی کاغذ ٹھیک نہ ہو، سامان میں دارو لے کے جا رہا ہوں تو سات روپے دوں۔ جب ایمانداری سے لے کے جا رہا ہوں تو سات روپے کیوں دوں۔؟

میں نے سات روپے نہیں دیئے تو بابو نے پھر میرے کاغذ دیکھے اور ان میں کوئی نقص نکال کر میری ٹرک کو آگے جانے سے روک دیا۔ دو گھنٹے میں سڑک کے کنارے ٹرک کھڑا کر کے بابو کی خوشامد کرتا رہا مگر جب وہ کسی طرح سے نہیں مانا تو میں نے سات روپے اس کو دیئے، پھر اگلے ناکے پر بھی دیئے اور اس سے اگلے ناکے پر بندھا بھتہ دیا اسی طرح احمد آباد سے واپسی پر بھی تینوں چار دو

جگہ بھتہ دیا۔ جب جاکے واپس پہنچا ہوں اور اب میں اور بچتر سنگھ حساب کرتے ہیں تو ہم کو فائدے کے بجائے اس دھندے میں بھی نقصان نظر آتا ہے۔ ٹرک میں دو ٹن بھر کے لے جائیں تو نقصان ہی نقصان ہے! بچتر سنگھ بولتا ہے، تین ٹن بھر کے لے جاؤ سب کو بھتہ دو اور کماؤ۔ مگر میں بولتا ہوں یہ تو کھلی بے ایمانی ہے..... ہے کہ نہیں ڈاکٹر صاحب!" گور دیال سنگھ حیران و پریشان اپنی میلی کالی لئے میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی میلی کالی کا کھلا، ورق زندگی کی کتاب کی طرح اپنے ماحول میں لرز رہا تھا اور اس کی ڈاڑھی کے بال الجھے الجھے تھے اور اس کی حیران آنکھوں کی نگاہیں الجھی الجھی تھیں اور پھر وہ بالکل مجبور اور بے بس آواز میں مجھ سے کہنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب! میں اپنے ہاتھوں سے اور کھری کمائی کرنا چاہتا ہوں، کیا مجھے اس دیس میں کوئی ایسا کام نہیں ملے گا؟" میں بھلا اُسے کیا جواب دیتا خاموشی سے سر جھکائے آگے بڑھ گیا۔

اب گور دیال سنگھ کا کام چل نکلا تھا اب میں اسے یا اس کے ٹرک کو بہت کم گراج میں دیکھتا، اور جب کبھی گور دیال سنگھ مجھے نظر آتا تو بے حد خوش اور شگفتہ مزاج دکھائی دیتا۔ کبھی کبھی وہ گھوڑے کی بوسکی کی قمیص اور ریشمی تہمد پہنے ہوئے ملتا۔ سر پر عمدہ کسی ہوئی کشتی نما پگڑی ہوتی اور اس کا کلینر بچتر سنگھ بھی اچھے صاف

صاف ستھرے کپڑوں میں ہوتا۔ ایکبار ہمسایوں نے مجھ سے شکایت بھی کی کہ کل رات کو گوردیال اور بچتر سنگھ نے شراب پی کر۔ ٹرک پر دنگا کیا۔ مگر مجھے اُن کی بات کا یقین نہ آیا۔ پھر بھی میں نے اپنا اطمینان کرنے کے لئے دوسرے دن علی الصبح گوردیال سے پوچھنا چاہا۔ مگر جب میں اوپر کی منزل سے نیچے لکڑی کے زینے سے اتر کر گراج کے باہر پہنچا تو گوردیال اپنا ٹرک لے کر جا چکا تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

چند ہفتوں کے بعد مجھے بنتا سنگھ فلوٹ ماسٹر نے بتایا کہ احمد آباد سے واپس آتے ہوئے بمبئی کے قریب گوردیال نے رانگ سائیڈ پر ٹرک چلاتے ہوئے ایک آدمی کو ہلاک کر دیا۔ ڈاکٹری معائنے پر گوردیال شراب میں دُھت پایا گیا۔

"سُنا ہے کل عدالت میں اُسے دو ماہ کی جیل بھی ہو گئی ہے۔" بنتا سنگھ دوا کی پڑیا جیب میں ڈالتے ہوئے بولا۔

مگر دوسرے ہی دن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے گوردیال کو لکڑیوں کے شکستہ زینے پر کھٹ کھٹ کرتے چڑھتے ہوئے دیکھا۔ اُس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا اور وہ مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھتے ہوئے سیڑھیاں چڑھتا چلا آ رہا تھا۔

"میں نے چلا کر کہا — ارے گوردیال تمہیں تو جیل ہو گئی تھی؟"

"ہاں جیل تو ہو گئی ہے ڈاکٹر صاحب۔ دو مہینے کی سجا ہوئی ہے۔"

مگر تم تو یہاں موجود ہو؟
"ہاں!" وہ مسکرا کر بولا ۔۔۔ "میں نے اپنی جگہ بچتر سنگھ کو جیل بھیجدیا ہے۔"
"اپنی جگہ بچتر سنگھ کو؟ حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ ۔۔۔ یہ ۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے؟"
"بہت آسان بات ہے" گوردیال سنگھ مجھے سمجھاتے ہوئے بولا۔
"میں نے اپنی جگہ مقدمہ میں بچتر سنگھ کو کھڑا کر دیا تھا جب وکیل نے اُس سے پوچھا تمہارا نام ۔ تو وہ بولا گوردیال سنگھ؟ باپ کا نام؟ گوربخش سنگھ ۔ کہاں کے رہنے والے ہو ۔ بٹی خورد ضلع لدھیانہ یہ اسکی ٹ ڈنٹ تم نے کیا؟ جی ہاں ۔ تم رانگ سائیڈ پر تھے؟ جی ہاں! ۔ تم اقبال جرم کرتے ہو؟ جی ہاں!
عدالت نے اُس کو دو ماہ کی سجا دیدی، وہ اب جیل میں ہے میری جگہ اور میں جیل کے باہر ہوں، وہ دو مہینے وہاں رہے گا اور میں یہاں باہر رہ کر ٹرک چلاؤں گا اور اپنا اور اُس کے بال بچوں کا پیٹ پالوں گا ۔ دھندا تو چالو رہنا ہی چاہئے ہے ۔۔۔ ڈاکٹر جی ۔۔۔ اور یہ احمد آباد والے کام میں بہت فائدہ ہے ۔ اب میں دو ٹن کے بجائے تین ٹن مال ٹرک میں بھر کے لے جاتا ہوں ۔ اور آتے جاتے دونوں طرف کے ناکوں کا بھتہ کٹا کر بھی بہت فائدے میں رہتا ہوں ۔ ایسا مذاری اس دیس میں گناہ ہے ڈاکٹر صاحب!

اگر میں ایماندار رہتا تو آج بھو کا مرتا، ابھی بچتر سنگھ کی بیوی رو رہی تھی۔ بول رہی تھی، میں سب جا کے عدالت میں کہہ دوں گی۔ میں نے اُسے دو سو روپے دئے تو چپ ہو گئی۔ آخر وہ بھی کیا کرے۔ بال بچوں کا پیٹ تو اُسے بھی بھرنا ہے، اور اگر بچتر سنگھ میری جگہ جیل نہ جاتا تو آج یہ ٹرک چلا کے کمائی کون کرتا؟ کیوں؟

مگر مجھے کسی طرح یقین نہ آ رہا تھا۔ مگر گوردیال سنگھ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے یہ کیسے ممکن ہوا؟ تم یہاں، تمہاری جگہ کوئی دوسرا آدمی جیل میں؟ ۔۔۔ یہ ۔۔۔ یہ ۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟

گوردیال سنگھ ہنسا، اس نے ڈبّے سے ایک پیڑا نکال کر میرے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"آپ بھی کتنے بھولے ہیں ڈاکٹر صاحب آپ کو زندگی کا کچھ پتہ ہی نہیں!



مُردہ سمندر

سمندر کنارے پر بیٹھا لیٹا ہوا اونگھ رہا تھا یا سو رہا تھا۔ ہم
چاروں ریت پر اُس کے قدموں میں بیٹھے ہوئے تاش کھیل رہے تھے
ایک مسلمان تھا، ایک ہندو، ایک مُردہ تھا ایک میں تھا۔

مسلمان نے غیر متوقع طور پر ایک سر جیت لی۔ وہ زور سے
چلّا پڑا۔ "ہا۔ مار لیا!"۔

ہندو نے اس کا بازو پکڑ کر خوف سے گھبرا کر کہا۔
"شور مت کرو سمندر جاگ جائے گا"

"سمندر؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں سمندر!" مردہ بولا "سمندر جو میرا وطن ہے، خاموش
گہرا اتھاہ سمندر، جہاں کبھی کچھ نہیں ہوتا"

"سمندر سیاہ ہے" میں نے پتّہ پھینکتے ہوئے کہا۔

"مگر شمال میں اس کا رنگ سنہرا ہو جاتا ہے۔" ہندو نے
مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن بحیرۂ عرب میں اس کا رنگ سرخ ہے!" مسلمان نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔

"سمندر بھی میری طرح مُردہ ہے" مُردہ بولا "ایک دم مُردہ!"

"مگر سمندر جاگ سکتا ہے!" میں نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

"اشوک نے کوشش کی تھی" ہندو بولا "وہ اوپر گیا اور نیچے گیا، وہ شمال میں گیا، اور جنوب میں گیا اور اس نے سمندر کو آواز دی لیکن سمندر نہیں بولا۔ پھر اُس نے اس کے سینے پر بندوق رکھ دی تو بھی سمندر نہیں بولا۔ کروٹ بدل کر سوتا رہا۔

"احمق!" مسلمان نے دانت پیس کر کہا اور غلام کا پتّہ زور سے پھینک دیا۔

ہندو مسکرایا اس نے بیگم پھینک کر جیت لی۔

بولا۔ "آخر اشوک ایک قلم لے کر چٹانوں کے پاس گیا اور ان پر کچھ لکھنے لگا۔ یکایک سمندر نے انگڑائی لی زمین کانپنے لگی۔ اور دُور اُفق پر ایک گرج سی پیدا ہوئی اور بجلی چمکنے لگی۔

جہاں پر میں رہتا ہوں، وہاں پر کوئی گرج نہیں ہے اور بجلی کبھی نہیں چمکتی۔! مُردے نے کامل اطمینان سے کہا۔

"کیا سمندر جاگا تھا؟ میں نے ہندو سے پوچھا۔

"اس نے آنکھیں کھولی تھیں اور اِدھر اُدھر دیکھا تھا۔"

"پھر۔؟"

"پھر وہ سو گیا" ہندو بولا۔

پھر اشوک مرگیا۔ مسلمان بولا - اور اس کے لہجے میں ہلکی سی خوشی تھی -

"پھر سب مرجائیں گے! - مُردہ فتحمند لگا ہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا -

"اور سمندر کبھی نہیں جاگے گا؟ میں نے پوچھا - میری آواز میں ہلکا سا ڈر تھا -

"مسلمان نے مجھے ڈراتے ہوئے کہا - جاگ سکتا ہے -! ایک بار اکبر نے بھی اُسے جگانے کی کوشش کی تھی۔

"آہ! اکبر!" میں نے کہا -

فاتح ہندوستان!" مسلمان نے کہا -

"دین الہی!" مردہ بولا -

"چیتوڑ!" ہندو نے اُسے جواب دیا -

"مسلمان نے سر سمیٹ لی - اور اپنی چگی ڈاڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔" وہ اوپر گیا اور نیچے گیا، وہ مشرق میں گیا اور مغرب میں گیا اور اُس نے نو روشنیاں جمع کیں اور ایک نغمہ -

"ایک نغمہ؟" میں نے پوچھا -

"صرف ایک نغمہ! مسلمان نے افسوس سے سر ہلا کر کہا۔" اور وہ اُس نغمے کو لے کر سمندر کے پاس گیا اور نغمے نے چلا چلا کر سمندر کو آواز دی -

"تو کیا سمندر جاگ گیا تھا؟ میں نے گھبرا کر پوچھا -

"نہیں" مسلمان نے کہا - مگر اُس نے آنکھیں کھولی تھیں -

اور اِدھر اُدھر دیکھتا تھا، اور اس کی نگاہوں میں بڑی بھوک تھی اور بڑی پیاس تھی "

جیسے وہ سب کو کھا جائے گا ـــ" ہندو کے بدن میں خوف کی ایک جھرجھری سی آئی ـ

" ہاں!" مسلمان بولا " جیسے وہ ہواؤں سے پانی کی آخری بوند بھی چوس لے گا! اور مسلمان کے دہشت زدہ نتھنوں نے ہوا کو سونگھا ـ

" جیسے وہ اٹھ کر کہکشاں پر ہاتھ ڈال دے گا ـ اور اسے کمان کی طرح جھکا کر اپنے ترکش کا تیر کائنات کے سینے میں پیوست کر دے گا؟" میں نے پوچھا ـ

" ہاں بالکل ایسی ہی نگاہ تھی اُس کی ـــ اور ـــ کچھ ـ اور بھی تھا " مسلمان نے سرگوشی میں کہا ـ

" کچھ اور بھی تھا؟" ہندو نے آگے جھک کر آہستہ سے پوچھا ـ

" ہاں!" مسلمان نے سوچ سوچ کر کہا " اُس کی نگاہوں میں خواب تھے! کچھ عجیب سے کچھ نئے سے .... کچھ اجنبی سے "

" اوہ! وہ خواب! مجھے ایسے خوابوں سے بڑا ڈر لگتا ہے " ہندو بولا ـ

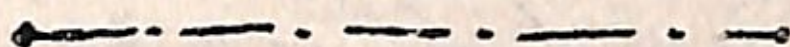
" مجھے بھی!" مسلمان نے کہا ـ

" میں تو خواب دیکھتا ہی نہیں " مردے نے کہا ـ " نہ نئے نہ پرانے، نہ عجیب، نہ اجنبی! "

" مگر سمندر نہیں جاگا نا؟" میں نے مسلمان سے تسلی حاصل کرنے کے لئے پھر پوچھ لیا ـ

"نہیں، سمندر نے ایک نگاہ سے اکبر کی طرف دیکھا پھر سو گیا۔
"سمندر جو میرا وطن ہے" مردے نے بڑے سکون سے۔ کامل قطعیت سے کہا۔ "سمندر جو کبھی نہیں جاگتا۔ سمندر جہاں مردے رہتے ہیں!"
مردے نے ہمیں آئینہ دکھایا اور بازی جیت لی۔
"مجھے سمندر سے بڑا ڈر لگتا ہے!" ہندو بولا۔
"مجھے بھی!" مسلمان بولا۔
"مگر ہم ایک کشتی میں بیٹھ کر سمندر پار تو کر سکتے ہیں!" میں نے پوچھا۔
"آہ۔ وہ کشتی!" ہندو نے افق پر آنکھیں گاڑ دیں۔
"وہ کشتی ابھی تک کیوں نہیں آئی؟" مسلمان نے اپنی گھڑی دیکھ کر کسی قدر تلخ لہجے میں کہا۔
ہم سب لوگ سوئے ہوئے سمندر کے کنارے بیٹھے ہوئے تاش کھیل رہے تھے، اور ہم سب کو کہیں نہ کہیں جانا تھا۔ ہندو کو بھی اور مسلمان کو بھی اور مجھے بھی۔ ہم سب کو اس کشتی کا انتظار تھا جو ہمیں پار لے جائے گی!
"ہا ہا... مردہ ظفریاب لہجے میں بولا۔ "وہ کشتی؟"
— وہ کشتی کبھی نہیں آئے گی۔ تم سے پہلے بھی یہاں بہت آئے اور سمندر کے کنارے سر پیٹ کر چلے گئے۔ اور سمندر نہیں جاگا اور اس کی مردہ لہروں میں کوئی ہل چل پیدا نہیں ہوئی، اور جب تک ہل چل پیدا نہ ہو کشتی کیسے سمندر میں چل سکتی ہے؟ اور تم سمندر میں تیر کر بھی پار نہیں جا سکتے، کیوں کہ تم تینوں سمندر سے ڈرتے ہو!"

ہم تینوں نے غصہ سے بر افروختہ ہو کر مُردے کی طرف دیکھا۔
مُردے نے تاش کی طرف دیکھا۔
تاش نے مُردے کی طرف دیکھا۔
مُردے نے تاش کو انگلی کے اشارے سے بلایا۔
تاش ریت سے اُٹھکر مُردے کی جیب میں چلی گئی۔
ہندو نے مسلمان کی طرف دیکھا۔ مسلمان نے میری طرف دیکھا میں نے مُردے کو بازو سے پکڑ لیا۔ مسلمان نے اُس کی ٹانگ پکڑ لی، ہندو نے اس کی کمر میں ٹھوکا دیکر اسے اچھال دیا۔
"کیا کرتے ہو۔ کیا کرتے ہو؟" مردہ زور سے چلایا۔
"تاش گر جائے گی! ارے میری تاش!"
ہم نے مُردے کو گھما کر سمندر میں پھینک دیا۔
یکایک سمندر جاگ گیا۔!



سمجھوتہ

واسنت مراٹھے کی شادی شاردا ڈیسائی سے ہوئی تھی۔ شاردا گجراتن تھی اور واسنت مراٹھا تھا۔ اور یہ شادی کبھی نہ ہوتی اگر واسنت کے باپ رام مراٹھے کا چمبوز میں لالٹین بنانے کا کارخانہ نہ ہوتا، اور اس کے کارخانے کے قریب شاردا کا باپ گلن لال ڈیسائی اپنا کانچ کا کارخانہ کھڑا نہ کرتا۔ رام مراٹھے کے کارخانے میں لالٹین بنانے کا سارا سامان تیار ہوتا تھا۔ سوائے کانچ کے ہنڈے کے۔ اور یہ ہنڈہ ڈیسائی گلاس ورکس سے آتا تھا۔ اس لئے واسنت اور شاردا کی شادی کیا ہوئی گویا گھر کی لالٹین مکمل ہوگئی۔!

واسنت ناٹے قد کا گٹھے ہوئے جسم کا نوجوان تھا اور دور سے بالکل اپنے کارخانے کی لالٹین کی طرح مضبوط، چوڑا اور سانولا نظر آتا تھا۔ شاردا گورے رنگ کی، لانبے قد کی بڑی بڑی آنکھوں والی نازک بدن، کانچ کی گڑیا سی دکھائی دیتی تھی۔ شادی کے بعد دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہوگئی، کیونکہ

ہندوستان میں شادی پہلے ہوتی ہے، محبت بعد میں ہوتی ہے۔ یوروپ میں محبت پہلے ہوتی ہے شادی بعد میں ہوتی ہے۔ بچہ دونوں صورتوں میں پیدا ہوتا ہے۔!

واسنت اور شاردا کے دو بچے تھے، لکشمن اور کملا، لکشمن چھ سال کا تھا، کملا چار سال کی تھی۔ دونوں میاں بیوی بڑے مزے میں اپنے بچوں کے ساتھ چار بیڈروم کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے جس کا نام لالٹین نواس تھا۔ یہ فلیٹ مگن لال ڈیسائی نے اپنی بیٹی کو جہیز میں دیا تھا۔

جس دن لکشمن پیدا ہوا اس دن اس کے دادا رام مراٹھے نے اپنے پوتے کے پیدا ہونے کی خوشی میں لالٹینوں کے ساتھ ساتھ لوہے کے ڈرم بنانے کا کارخانہ بھی چالو کر دیا۔ پھر جس دن شاردا کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی اس دن لڑکی کے نانا نے کانچ کے برتنوں کے ساتھ ساتھ تھرما میٹر بنانے کا کارخانہ بھی شروع کر دیا اور مگن لال ڈیسائی نے اپنے کارخانے کا سب سے پہلا بیرومیٹر واسنت اور شاردا کے گھر میں لگا دیا، تاکہ دونوں میاں بیوی کو لڑائی کے سمے ایک دوسرے کے ٹمپریچر کا اندازہ ہوتا رہے۔!

شادی شدہ زندگی کے سات سال بڑے مزے میں کٹ گئے۔ پھر جس دن رنگا ریڈی نے صابون بنانے کا کارخانہ سائن میں چالو کیا۔ اور سردار جاپان سنگھ نے دادر میں دی گریٹ مون شائن فلم کمپنی کا مہورت کیا، اس دن بمبئی میں ایک طوفان اٹھا۔

ہنگامہ ہوا — گولی چلی — ٹراموں پر پتھراؤ ہوا — سینکڑوں لوگ زخمی ہوئے اور دوسرے دن اخبار دیکھ کر واسنت کی آنکھیں غصے سے لال ہو گئیں اور اس نے اخبار کو زور سے ناشتے کی میز پر پٹخ دیا - اور بولا —

"چھ چ"

"سوئٹ تھیے" شاردا بولی -

واسنت نے کہا "یہ اخبار بولتا ہے کہ بمبئی اکیلے مراٹھوں کی نہیں ہے، لیکن سب جانتے ہیں کہ بمبئی ہماری ہے، ہمیشہ ہماری رہے گی -! ہم مراٹھوں کی !"

شاردا نرمی سے بولی "ہاں ہاں بمبئی تمہاری ہے بے شک تمہاری ہے، لیکن وہ ہماری بھی تو ہے ! ہم گجراتیوں کی !"

"واہ، بمبئی تمہاری کیسے ہو گئی ؟ — بمبئی تو مراٹھوں کی ہے -!"

"نہیں وہ گجراتیوں کی ہے !" شاردا ذرا غصہ سے بولی "یہ سارا شہر ہم نے بنایا ہے، اس کا بزنس ہم نے چلایا ہے، اس کا کارخانہ ہم نے لگایا ہے ...... تم کدھر سے حق جتانے لگے ہماری بمبئی پر ؟"

"شہر تم نے بنایا ہے ؟ — لیکن اس شہر کو بڑھایا کس نے ہے — ؟ بزنس ضرور تم نے چلایا ہے - لیکن اس بزنس کو پھیلایا کس نے ہے، کارخانے تم نے لگایا ہے، لیکن کارخانے میں کام کون کرتا ہے : ہمارے مہاراشٹر کا مزدور ! سمجھیں ؟ — بمبئی آمچی آہے !" واسنت نے آملیٹ کو چھری سے کاٹتے ہوئے کہا —

"نا ! بمبئی اماری چھے" شاردا اوچی ٹیبل کٹلس پر نمک چھڑک کر بولی !

"اگوی کھوٹا بولتا !"

"تمہ جے گھوچھے تے جھٹ دچھے ۔ تن جھوٹھو چھے!!"

"بمبئی آپچی آہے"

"نا ماری چھے"

واسنت نے چائے کا چمچہ زور سے میز پر پٹخ دیا۔ شاردا نے چھری کانٹے پلیٹ میں پھینک دیئے۔ دونوں ناشتے کی میز سے اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں جاکر بند ہو گئے۔

بچے سہم کر سسکنے لگے۔

جب اس جھگڑے کی خبر مگن لال ڈیسائی اور رام مراٹھے تک پہنچی تو دونوں بڈھے نوجوان میاں بیوی کی حماقت پر بڑے ہنسے۔ رام مراٹھے نے مسکرا کر کہا۔

"مگن بھائی۔ ہمارے بچے کس قدر بھولے ہیں نہیں جانتے کہ مہاراشٹر بن جائے چاہے گجرات الگ ہو جائے مگر گجراتیوں کو مراٹھوں کی ضرورت تو رہے گی، اور مراٹھوں کو گجراتیوں کی۔!"

ہاں! جیسے تمہاری لالٹین کو میرے کانچ کے ہنڈے کی ضرورت ہوتی ہے اور میرے کانچ کے ہنڈے کو تمہاری لالٹین کی۔!

مگن لال ڈیسائی نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"بالکل! رام مراٹھا سر ہلا کر بولا۔

"تو چلو۔ چل کر ان دونوں بے وقوفوں کو سمجھائیں!"

مگن لال ڈیسائی نے تجویز پیش کی اور دونوں بزرگ اسی وقت اپنی اپنی آرام کرسیوں سے اٹھے اور موٹر میں بیٹھ کر لانسٹین نواس پہنچے اور وہاں جاکر واسنت اور شاردا کو سامنے بٹھا کر سمجھانے لگے۔

واسنت کے باپ نے اپنے بیٹے کو ڈانٹتے ہوئے کہا "شرم نہیں آتی میری بہو کو تنگ کرتا ہے!؟"

مگن بھائی نے شاردا سے کہا "نالائق اپنے پتی سے جھگڑا کرتی ہے ۔؟"

"میں تو جھگڑا نہیں کرتی پتا جی! شاردا سسکتے ہوئے بولی" یہی جھگڑا کرتے ہیں ۔ بولتے ہیں ۔ تم گجراتی لوگ بہت خراب لوگ ہوتے ہو، ہمیشہ ہم مراٹھوں کا حق مارتے ہو۔"

"ایسا؟" مگن لال ڈلیسائی چونکتا ہو کر واسنت کی طرف دیکھنے لگا۔ واسنت نے سر جھکا کر اپنے باپ سے کہا "پتا جی شاردا کہتی ہے کہ، کھا بمبئی گجراتی لوگوں نے بنایا ہے اور اس شہر کا سارا بزنس اس کا سارا دھندا گجراتی لوگ چلاتے ہیں ۔ شاردا بولتی ہے کہ ہم گجراتی لوگ نہ ہوں تو مراٹھے بھوکے مر جائیں ۔"

"ایسا؟" رام مراٹھے نے گھور کر شاردا کی طرف دیکھا ۔ اور گرج کر پوچھا ۔ کیا تم نے ایسا کہا تھا ۔؟ اور یہ کہتے کہتے رام مراٹھے غصہ سے کھڑا ہو گیا ۔

پیشتر اس کے کہ شاردا کوئی جواب دیتی اس کے باپ نے اسے پیچھے دھکیل دیا اور خود رام مراٹھے کے سامنے کھڑا ہو کر کہنے لگا اگر میری بیٹی نے نہیں بھی کہا تو میں اب کہتا ہوں کہ اس نے کہا ہے اور جو اس نے کہا ہے وہ بالکل ٹھیک کہا ہے۔

رام مراٹھے دانت پیس کر آگے بڑھا اور بولا اگر تمہاری بیٹی نے ٹھیک کہا ہے تو میں کہتا ہوں کہ میرے بیٹے نے بھی جو کہا ہے

وہ بالکل ٹھیک کہتا ہے!

"بمبئی اماری چھے!" — مگن لال ڈیسائی نے چلّا کر کہا اور شاردا کا ہاتھ پکڑ کر غصّے سے بولا۔

چل بیٹی اپنے گھر چل۔ ہم کوئی ایسے گرے پڑے نہیں ہیں کہ تجھے پناہ نہ دے سکیں۔

"جانتے ہو تو جاؤ" — رام مراٹھے اپنی چھڑی ہواؤں میں گھما کر بولا "مگر کہے دیتا ہوں دوبارہ اس گھر میں گھسے تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

"بڑے آئے ٹانگیں توڑنے والے — جیسے بمبئی تمہارے باپ کی ہے!"

"ہاں! ہاں! بمبئی میرے باپ کی ہے بلکہ میرے باپ کے باپ کی ہے —" واسنت کا باپ گرج کر بولا۔ "جے مہاراشٹرا!"

"جے مہا گجرات!" مگن لال ڈیسائی نے ترکی بترکی جواب دیا اور اپنی بیٹی اور بچوں کو لے کر فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

آج واسنت کے فلیٹ میں اندھیرا تھا۔

شاردا کو گھر چھوڑے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ ایک سال سے واسنت نے نہ شاردا کی صورت دیکھی تھی نہ اپنے بچوں کی۔ اس ایک سال میں بہت کچھ ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے اندولن چلے، آپس کے

لڑائی جھگڑے ہوئے۔ مگر آخر میں سمجھوتہ ہو گیا۔ بمبئی کا صوبہ تقسیم ہو گیا، گجرات کا صوبہ الگ بن گیا، مہاراشٹر کا صوبہ الگ وجود میں آیا۔ پارلیمنٹ نے بھی بل پاس کر دیا ہر چیز طے ہو گئی۔ ساری نفرتیں اور کدورتیں دھو ڈالی گئیں اور آج ۲۹ر اپریل کو تو روشنیوں کا دن تھا، گانے، ناچ، جلسے، جلوس، ہنگامے، غل غپاڑے، تماشے مشاعرے، کوی سمیلن، تقریریں، نعرے، ڈھول، تاشے، باجے گاجے.....

لوگوں نے آج سارے بمبئی میں روشنی کی تھی اور اسے دلہن کی طرح سجا دیا تھا۔ مگر واسنت کے اپنے فلیٹ میں آج اندھیرا تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ سڑکوں کے دو رویہ درختوں پر بجلی کے ہزاروں ننھے جگمگا رہے ہیں۔

ہواؤں میں خوشبو تھی، فضاؤں میں قہقہے تھے، عورتیں آنکھوں میں کاجل لگائے، جوڑے میں شوخی کی وینی سجائے بچوں کو انگلی سے لگائے اس کے فلیٹ کے نیچے سے گزر رہی تھیں۔

واسنت کا دل اپنے بیوی بچوں کی یاد سے بے چین ہو اٹھا۔ کئی بار اس سے پہلے بھی اس نے سوچا تھا کہ وہ احمد آباد جائے اور اپنی بیوی سے صلح کر کے اسے بچوں سمیت واپس بلا لائے مگر ہر بار ایک جھوٹی عزت اس کا دامن پکڑ کر روک لیتی تھی۔

آج اسے نہ صرف شاردا بلکہ اپنے پیارے بچے بھی کتنے یاد آ رہے تھے۔ ننھا لکشمن اور بھولی کملا۔ ان دونوں معصوم بچوں کی صورتیں گویا اس کے دل کے دامن کو پکڑنے لگیں اور وہ سوچنے لگا۔

بھلا اس نے کیوں اپنی بیوی سے جھگڑا کیا۔ خواہ مخواہ اپنا گھر برباد کیا۔ بھلا کیوں؟

بمبئی کے مہاراشٹر میں آجانے سے کیا اس کی صورت بدل گئی ہے؟ کیا اس کا میرین ڈرائیو اٹھکر پونا چلا گیا ہے۔ کیا تاڑا بیے کا ایکڑ ناگپور بھیج دیا گیا ہے؟ کیا فورٹ کا علاقہ ناگپاڑے میں آباد کر دیا گیا ہے؟ کیا آج بھی لوگ سڑکوں پر نہیں سوتے غلیظ کھولیوں میں نہیں رہتے۔ دکھ اور درد کا درماں نہیں ڈھونڈتے؟ مفلسی اور موت کا سامنا نہیں کرتے۔؟ پھر کس لئے اس نے اس قدر جذباتی ہو کر اپنی پیاری بیوی سے جھگڑا کر لیا اور اپنے بچوں کو اپنے آپ سے دور کر دیا۔

آج ہر گھر میں روشنی ہے۔ صرف اس کے گھر میں اندھیرا ہے۔ اور اس کے دل میں اتنی ہمت باقی نہیں ہے کہ اپنے اندھیرے کونے سے اٹھ کر ایک بتی بھی روشن کر دے۔

دیر تک اسی طرح جلتا، کڑھتا اور سوچتا رہا اور ایک اندھیرے کونے میں آرام کرسی پر آنکھیں بند کئے ٹانگیں سکیڑے لیٹا رہا۔ اور اس کے چاروں طرف خوشبوؤں کا جلوس گزرتا رہا۔ دو تین بار اس کے کانوں میں آواز سی آئی جیسے کوئی اس کے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہو، مگر آج وہ کسی سے ملنا نہ چاہتا تھا۔ اس لئے وہ اٹھ کر دروازے تک بھی نہ گیا۔ جو بھی ہوگا خود ہی دروازہ پیٹ کر چلا جائے گا۔۔۔ یا بہت ہی ڈھیٹ ہوگا تو خود ہی اندر آجائے گا۔

پھر یکایک اس کے کانوں میں ایک آواز آئی۔ ارے آج خوشبو

کے روز یہاں اس قدر اندھیرا کیوں ہے ؟ اور اس آواز کے ساتھ ساتھ ایک بتی جلی اور اس بتی کی روشنی میں واسنت نے دیکھا کہ دروازے پر شاردا بچوں کو انگلی سے لگائے کھڑی ہے اور مسکرا رہی ہے!

ایک لمحے کے لئے اس نے چونک کر شاردا کی طرف دیکھا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آ رہا ہو، پھر وہ یکلخت اپنی کرسی سے اٹھا اور دوڑ کر دروازے کی طرف گیا اور جھپٹ کر اس نے جلدی سے اپنے دونوں بچوں کو گود میں اٹھا لیا۔ اور انہیں پیار کرنے لگا — شاردا نے یکایک منہ پھیر لیا اور بالکونی کے جنگلے کے قریب جا کر بولی "شرم نہیں آتی ہے لوگوں کو ہمارا شنکر کے جنم دن پر میرے گھر میں اندھیرا کرتے ہیں۔"!

واسنت کچھ نہ بولا " مگر اس کی نگاہوں میں خوشی کے دیئے قطار اندر قطار مسکرانے لگے — پھر وہ دھیرے سے اپنی بیوی کے قریب گیا اور سر جھکا کے بولا۔

"شاردا مجھے یقین نہیں آتا کہ تم آ گئی ہو"؟

شاردا نے بالکونی پر مٹی کے دیوں میں تیل ڈالتے ہوئے کہا "کیوں نہ آتی ؟ کیا یہ گھر میرا نہیں ہے — ؟ کیا یہ بمبئی شہر میرا نہیں ہے"؟

شاردا نے بے خوف نگاہوں سے واسنت کی طرف دیکھ کر کہا "بمبئی آ چکی ہے —

واسنت نے مسکرا کر کہا " تمہاری جیسے ! تم نے تمہاری

جیسے!! — نہ صرف بمبئی تمہاری ہے۔ یہ گھر بھی تیرا ہے اور میں خود بھی تیرا ہوں، اگر یقین نہ آئے تو سٹامپ پیپر پر لکھوا لو!

شاردا کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا، اُس نے اپنا سر واسنت کے کندھے پر رکھ دیا اور جذبات سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں نے غلطی کی جو یہاں سے چلی گئی، میں بھول گئی کہ اس دیس میں نہ کچھ تیرا ہے نہ میرا ہے —— یہ سارا دیس ہمارا ہے، اور یہاں جتنے بھی مراٹھے اور گجراتی، پنجابی اور سندھی، بنگالی اور ملیالی۔ ہندو اور مسلمان سکھ اور عیسائی، یہودی اور پارسی رہتے ہیں ایک ہی ماں کے بیٹے ہیں گو صوبے الگ الگ ہیں۔ مگر ملک ایک ہے گو کمرے الگ الگ ہیں مگر گھر ایک ہے۔ میں گجراتی ہوں، تم مراٹھے ہو۔ مگر ہم دونوں کا مستقبل ایک ہے!"

واسنت نے مسکرا کر شاردا کو اپنے گلے سے لگا لیا اور پھر بچوں کو لے کر باہر بالکونی میں آ گیا۔ جہاں ان کے چاروں طرف روشنی ہی روشنی تھی۔!!



کھٹے انار، میٹھے انار

وہ اس دنیا میں میرا سب سے اچھا دوست تھا۔ اس کا جسم دُبلا تھا۔ قد چھوٹا۔ رنگ سیاہ، گال اندر کو پچکے ہوئے، ہونٹ بے حد سیاہ۔ لیکن جب وہ ہنستا تھا تو اُس کے سارے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا۔ اُس کی گول گول سیاہ بٹن جیسی آنکھوں میں دلیری اور شرارت کی چمک آجاتی تھی اور اُس کی تیز ہنسی کا فوارہ یوں پے در پے قہقہوں میں چھوٹتا تھا۔ جیسے دیوالی کی رات میں سیاہ آسمان کے پس منظر میں ایک آتشیں انار فضا میں بلند ہو جائے اُس کا نام منو تھا۔ وہ ہمارے باغ کے مالی کا لڑکا تھا۔ اُس کی عمر بمشکل چھ سات سال کی ہوگی۔ اتنی ہی میری عمر ہوگی۔

ہمارا باغ بہت خوبصورت تھا، اس میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے فوارے تھے، پھولوں کے قطعے تھے، اونچی نیچی گھاٹیاں اور ڈھلوانیں تھیں۔ ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس پر ایک منّا سا پل بنا ہوا

تھا۔ جس پر غروب آفتاب کے وقت میری بڑی بہن اور اُس کا شوہر آتے اور اُس پل پر کھڑے ہو کر ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر الوؤں کی طرح ڈوبتے ہوئے سورج کو چپ چاپ دیکھا کرتے اور منہ سے کچھ نہ کہتے ۔۔۔ جانے یہ بڑی عمر کے لوگ ڈوبتے ہوئے سورج میں کیا دیکھتے ہیں؟

میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

ہمارے باغ میں کاشمیری سیب تھے اور فرنچ ایپل اور کلو کے کھٹے میٹھے سیب، سنہری خوبانیوں کے پیڑ تھے اور ہری ہری جلد والے بیلم جو جب پک جاتے تو جگہ جگہ سے اودے ہو جاتے اور ان کی جلد میں دانت گڑو دو تو ان میں سے لہو کی طرح سرخ رس نکلتا تھا۔ وہاں پر بگوگوشے تھے اور ناخ۔ اور ٹینگ، آلوچے آلو بخارے، شفتالو، چیری اور شہتوت، جب بہار آتی تو اتنے رنگوں کے پھول لے کر آتی۔ اتنے پرندوں کی چہکاریں لے کر آتی، اتنے بھونروں شہد کی مکھیوں اور رنگین تتلیوں کی اڑانیں لے کر آتی کہ ان سب کے پیچھے بھاگنا مشکل تھا، بڑا ہی خوبصورت باغ تھا ہمارا۔ دنیا کا وہ کونسا درخت تھا جو ہمارے باغ میں نہیں تھا۔؟

بس ایک کمی تھی ہمارے باغ میں انار کا پیڑ نہیں تھا! چھوٹی چھوٹی کھٹی اناریوں کے تو بہت سے پیڑ تھے، لیکن میٹھے انار کا ایک بھی پیڑ نہیں تھا، اور جتنے میٹھے انار تھے سب راجاجی کے باغ میں تھے دنیا کے کسی باغ میں نہ تھے، اور جب ہمارے باغ میں نہ تھے تو اور کہاں ہوں گے۔

نہر میں نہاتے نہاتے جو اوپر کے پہاڑی چشموں سے آتی تھی اور شہر کے لئے پانی پینے کے لئے لاتی تھی اور راجہ جی کے باغ کے قریب سے گزرتی تھی جب میں اور منو راجہ جی کے غبارہ دار آسنی جنگلوں کے پیچھے میٹھے اناروں کو درختوں سے لٹکتے ہوئے دیکھتے تو ہمارے منہ میں پانی بھر آتا۔ کیسے پیارے پیارے انار تھے وہ! جلد کیسی صاف اور شفاف، ہلکی ہلکی اداہٹ اپنے رخساروں پر لئے ہوئے، وہ انار کس طرح فضا میں جھومتے اور ہنستے دکھائی دیتے تھے۔ پہلے تو انار کی شاخوں پر منہ بند کلیاں پھوٹتی تھیں پھر انہیں کلیوں میں شہابی رنگ کے پھول کھلتے تھے، پھر ان پھولوں کے دہانے سے چھوٹے چھوٹے کورا انار پیدا ہوتے تھے اور بڑھتے بڑھتے شہد کی ڈولیوں کی طرح لٹکنے لگتے تھے۔ پھر ایک دن شاخیں خالی ہو جاتیں اور ہمیں معلوم ہو جاتا کہ جتنے میٹھے انار تھے سب راجہ جی کے محل میں پہنچ گئے۔

نہر میں تیرتے تیرتے میں اور منو خالی درختوں کو بڑی حسرت سے تکا کرتے۔ کیا ہماری قسمت میں میٹھے انار کبھی نہ آئیں گے؟

ایک روز جب میٹھے اناروں کا جوبن عین شباب پر تھا مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے پانی میں تیرتے تیرتے پانی کی کلیاں منو پر پھینکتے ہوئے کہا۔

چلو۔ راجہ جی کے باغ میں چلیں۔ میٹھے انار توڑ لائیں۔

منو ڈر گیا۔ بولا۔ راجہ جی ماریں گے۔!

راجہ جی کہاں ہیں بدھو! وہ تو اپنے محل میں ہیں۔

تو مالی ہوگا - تمہیں معلوم ہے راجہ جی کے باغ کا مالی کتنا ظالم ہے - میرا باپ کہتا تھا......

میں نے اُس کی بات کاٹ کے کہا - اس تپتی دوپہر میں مالی کہاں ہوگا - سو رہا ہوگا - مجھے تو کہیں نظر نہیں آتا!

کسی جھاڑی کے پیچھے چھپا بیٹھا ہوگا - جنّو! منّو نے انتہائی رازداری سے کہا - تم نہیں جانتے سبھی مالی ایسا کرتے ہیں، میرا باپ بھی اسی طرح گھات لگا کے بیٹھتا ہے اپنے باغ میں - جب باہر کے لڑکے باغ پر چھاپہ مارنے کی کوشش کرتے ہیں -

میں سب جانتا ہوں! وہ بڑی دانشمندی سے بولا -

میں نہر سے نکل کر خاردار آہنی جنگلے کے قریب آگیا اور بولا -

منّو بڑے بزدل ہو اندر جانے سے ڈرتے ہو؟

منّو اُچک کر کنارے پر آرہا! وہ اپنی لنگوٹی کستے ہوئے بولا، کون ڈرتا ہے؟ میں کہ تم؟ اندر چل کے دیکھو -

اتنا کہہ کر وہ دو تاروں کو اوپر نیچے کھینچ کر باغ کے اندر کود گیا اُس کے پیچھے میں کودا، جلدی جلدی ہرن کی طرح قلانچیں بھرتے ہوئے ہم دونوں ایک ہی پیڑ پر چڑھ گئے اور میٹھے انار توڑ توڑ کر اپنی جھولیاں بھرنے لگے -

لیکن پہلا انار ہم نے جھولی میں نہیں ڈالا، اُسے توڑ کر فوراً دانت سے کاٹا - میٹھے اناروں کا شہد اور اس کی جلد کا کڑوا ذائقہ دونوں ذائقے ایک ہی لمحے میں ہماری زبان پر آئے، لیکن برسوں کی حسرت نے کڑواہٹ کا ذائقہ بھلا دیا، ہونٹوں پر اناروں کی شہد آگئیں

مٹھاس باقی رہ گئی۔

میں نے چٹخارے لیتے ہوئے کہا۔ ہونہہ! کتنا میٹھا ہے!
اس کے بعد پیڑوں کی ڈالیاں یکے بعد دیگرے ہلنے لگیں۔ ہم نے
اتنے انار توڑ لئے جتنے ہماری جھولی میں بھی نہ آسکتے تھے۔ بڑی مشکل
سے اور بڑی حسرت سے ان اناروں کو تکتے ہوئے ہم پیڑ سے اترے
ابھی کتنے ہی انار درخت پر باقی رہ گئے تھے اور ابھی سارا باغ ان
اناروں سے بھرا پڑا تھا، کاش ہماری جھولی بھی اتنی بڑی ہوتی جتنا
ہمارا دل تھا!

,, چلو اب بھاگ چلیں! میں نے صلاح دی!
منو کی للچائی ہوئی نظریں دوسرے پیڑ پر پڑیں۔
اس نے آہستہ سے کہا۔ چنو۔ دیکھو۔ اس پیڑ کے انار کتنے
بڑے بڑے ہیں۔!
مالی آجائے گا!
مالی کی ایسی تیسی! منو بڑی جیداری سے بولا۔
راجہ جی آجائیں گے۔
جواب میں منو نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ منو کے ہلوں کو
خون لگ چکا تھا۔ اب وہ کسی راجہ کی پرواہ نہ کرتا تھا۔
منو نے کہا۔ ہم ان اناروں کو اس جھاڑی کے نیچے چھپا دیں گے
اور اس پیڑ پر چڑھ کر بڑے بڑے انار توڑیں گے۔
ہم دونوں گلاب کی جھاڑیوں کے پیچھے جا کر اپنی جھولی کی
گانٹھیں کھول کر انار نیچے گرانے ہی والے تھے کہ ایک زبردست

ہاتھ منو کی گردن پر پڑا اور ایک نیری پیٹھ پر اور کسی نے ہمیں گھما کر اپنی مضبوط ٹانگوں میں جکڑ لیا۔

ایک دیو ہیکل مالی ہمارے سر پر کھڑا تھا اور ہم اس کی ٹانگوں میں جکڑے ہوئے تھے اور ہماری جھولیاں اناروں سے بھری ہوئی تھیں اور منو رونے لگے۔ خاردار جنگلے کے باہر کیسی خوبصورت نہر تھی، اس کا نیلا اور چمکتا ہوا پانی ترل ترل ترل کرتا ہوا کس بے باکانہ آزادی سے بہہ رہا تھا۔

مالی نے ہم دونوں کو لے جا کے راجہ جی کی حوالات میں بند کر دیا۔

سارے شہر میں آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی۔ راجہ جی کے باغ میں چور گھس آئے تھے، انھوں نے راجہ جی کے میٹھے انار توڑ لئے تھے۔ صدیوں سے کسی کی یہ ہمت نہ ہوئی تھی کہ راجہ جی کے میٹھے اناروں کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی دیکھے۔ حسرت ہر ایک کے دل میں تھی ہمت کسی کے دل میں نہ تھی۔ ایک دم یہ کیسے ہو گیا۔

لوگ متعجب تھے اور جوق در جوق ہمیں دیکھنے کے لئے آنے لگے اور ہمیں دیکھ کر اور بھی حیرت کا اظہار کرنے لگے۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے ننگ دھڑنگ بچے ایک لنگوٹی پہنے ہوئے، دوسرا خالی نیکر پہنے ہوئے۔ یہ نحیف اور کمزور بچے۔ انھوں نے میٹھے اناروں پر ہاتھ ڈالا تھا۔

ایک گھنٹہ گزر گیا ۔۔۔ دو گھنٹے گزر گئے، جب سہ پہر جانے لگی تو حوالات کا آہنی دروازہ شور مچاتا ہوا کھلا اور میرے والد مری

روتی ہوئی والدہ کو لے کر حوالات میں داخل ہوئے ۔ میری والدہ نے لپک کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور سسک سسک کر رونے لگی اور میرا منہ چومنے لگی۔ میں بھی رونے لگا منو بھی۔

میرے والد نے مجھے انگلی سے لگا لیا۔ اور بولے۔

چلو گھر چلو!

میں اپنے والد کے ساتھ ہولے ہولے چلنے لگا۔ یکا یک منو دوڑتا ہوا آیا اور میرے باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ چاچا مجھے بھی لے چلو چاچا جی!

میرے باپ نے پلٹ کر منو کو ایک لات جمائی۔ منو دھڑام سے حوالات کے سخت فرش پر جا گرا اور پھر اٹھا۔ اب کے میری ماں نے اسے بڑے زور کا طمانچہ رسید کیا اور بولی۔

بدمعاش ہمارے بچے کی عادت بگاڑتا ہے اسے بری بری باتیں سکھاتا ہے!

میں نے تجھے اسی دن کے لئے کہا تھا۔ میرے والد میری ماں سے تہدیدی آواز میں کہنے لگے۔ اپنے بچے کو بری صحبت سے بچائے رکھ۔ انہیں ان کمینوں کے ساتھ نہ کھیلنے دے۔ مگر تو کہاں میری بات سنتی ہے۔

تھانیدار بولا! ڈاکٹر صاحب! آپ راجہ جی کا علاج کرتے ہیں اسی لئے آپ کے بچے کو چھوڑ دیا۔ ورنہ آپ جانتے ہیں راجہ جی کے باغ میں کوئی چڑیا پر نہیں مار سکتی۔

میں جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ میرے والد بڑی بے بسی سے

بولے - آپ کی بڑی مہربانی ہے تھانیدار صاحب! آئندہ سے میں خود خیال رکھوں گا -

میرے والد مجھے لے کے چلے آئے حوالات کا آہنی دروازہ منّو پر بند ہو گیا -

شام ڈھلے منّو بھی واپس آ گیا - ماں کی تو ہمت نہ پڑی تھی لیکن منّو کی ماں اپنے چاندی کے کڑے گروی رکھ کے دس روپے لے کے تھانیدار کے پاس گئی - اور اُس سے اپنا بچہ چھڑا لائی - جب میں نے منّو کو دیکھا تو وہ اُس وقت اپنے جھونپڑے سے کچھ دور حیران و پریشان گلاب کی ایک جھاڑی کے پاس کھڑا کچھ سوچ رہا تھا - میں خوشی کے مارے بھاگتا ہوا اس کے پاس گیا اور اس سے کہا - آؤ منّو کھیلیں -

منّو چپ رہا -

میں نے منّو کو لالچ دلاتے ہوئے کہا - آؤ شرط بدتے ہو؟ اگر تم آڑو کی اس آخری ٹہنی تک پہنچ جاؤ تو میں تمہیں چار پیسے دوں گا -

چار پیسے! چار پیسے!!

چار پیسے بہت ہوتے ہیں، منّو کی آنکھوں میں حرص اور خوشی کی ایک چمک ایک لحظہ کے لئے پیدا ہوئی -

مجھے بھی معلوم تھا اور منّو کو بھی معلوم تھا کہ منّو مجھ سے زیادہ تیزی سے درخت کی آخری ٹہنی پر پہنچ سکتا ہے - وہ پیسے گویا اس کی جیب میں تھے، مگر وہ خوشی کی کھلکھلاتی ہوئی چمک صرف ایک لحظے کے لئے منّو کی آنکھوں میں نمودار ہوئی، دوسرے لحظے میں یکایک

منّو! مجھے معلوم ہے کس پیڑ کی کس شاخ پر دو ناشپاتیاں پک کے سنہری ہو گئی ہیں آؤ ان کو چل کے حاصل کر لیں۔ ایک میں لوں گا دوسرا تمہیں دوں گا۔

سچ!

منّو نے پھر آہستہ سے انکار میں سر ہلا دیا۔ دیکھو منّو شام جاری ہے خوبصورت تتلیاں پھولوں میں سر چھپانے کی جگہ ڈھونڈ رہی ہیں آؤ تتلیاں پکڑ لیں ڈھیر ساری تتلیاں پکڑ لیں۔ اب وہ اڑ نہ سکیں گی۔

منّو نے پھر انکار میں سر ہلا دیا۔

میں تمہیں دو پٹاخے دوں گا۔ آؤ میرے ساتھ کھیلو۔

منّو نے پھر سر ہلا دیا۔

میں نے بڑی لجاجت سے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور اس سے کہا۔ کیوں منّو۔ میرے ساتھ کیوں نہیں کھیلو گے؟ کیا تم میرے دوست نہیں ہو؟

منّو کا ہاتھ ذرا سا آگے بڑھا۔ پھر واپس اپنی جگہ پر چلا گیا اس کی گردن کا حلقوم دو تین بار گویا اس کی ڈبلی پتلی گردن کے اندر رگڑ کھاتے ہوئے اوپر نیچے گزرا پھر اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔

اس نے بڑی مشکل سے اپنے روندھے ہوئے گلے سے کہا۔

نہیں چنّو تم ڈاکٹر کے لڑکے ہو۔ میں مالی کا لڑکا ہوں۔

تیری تمہاری دوستی کیا ؟

اتنا کہہ کر وہ روتا ہوا اُٹھا اور اپنے جھونپڑے
کے اندر چلا گیا !



بابو تیرے نام پر....!

مکھن سنگھ ساکن موضع چک جھمرا لہنا سنگھ۔ ساکن موضع ڈاڈھو کی وال نے مقدمہ دائر کر دیا تھا۔

موضع چک جھمرا اور ڈاڈھو کی وال ایک دوسرے کے قریب قریب واقع تھے اور دونوں گاؤں کے کھیتوں کی حدیں بھی ایک دوسرے سے آگے مل جاتی تھیں، جھگڑا زمین کی حد بندی کے سلسلے میں تھا۔ مکھن سنگھ اور لہنا سنگھ کے کھیت پاس پاس واقع تھے اور ایک کھیت کے سلسلے میں عرصہ سے جھگڑا چلا آتا تھا۔

لہنا سنگھ نے انگریزوں کے راج میں بھی ایک دفعہ مکھن سنگھ سے جھگڑا کیا تھا مگر اس وقت لہنا سنگھ کو کامیابی نصیب نہ ہوئی تھی۔

لہنا سنگھ بڑا جھگڑالو جاٹ تھا۔ بخلاف اس کے مکھن سنگھ کی شرافت

اور سادگی کے سبھی قائیل تھے۔ مکھن سنگھ نے آج تک کبھی کسی سے جھگڑا نہ کیا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں اس سے پہلے صرف ایک بار عدالت میں گیا تھا اور وہ بھی اُسی لہنا سنگھ کی شرارت کی وجہ سے گو انگریزوں کا زمانہ تھا اور پٹواری شام داس لہنا سنگھ سے درپردہ ملا ہوا تھا۔ مگر پھر بھی واہگورو نے مکھن سنگھ کی لاج رکھی تھی اور لہنا سنگھ کا مقدمہ خارج ہو گیا تھا۔

اس بات کو بھی کئی سال بیت گئے۔ اب فرنگیوں کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ اب ملک آزاد ہو چکا تھا اب اپنا راج تھا۔ اس راج کے حصول کے لئے مکھن سنگھ نے بھی ایک دفعہ قربانی دی تھی گانگریس والے سردار منگل سنگھ ایک دفعہ اُس کے گاؤں میں آئے تھے بڑا زبردست مورچہ لگا تھا۔ گاؤں کے کچھ کسانوں نے انگریزی سرکار کو لگان اور مالیہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ زیادہ کسان گھر تو اس تحریک میں شامل نہ ہوئے تھے، پھر بھی دس بارہ کسان منگل سنگھ کے کہنے پر ڈٹ گئے تھے، لاٹھی بھی چلی تھی، گولی بھی۔ مکھن سنگھ کا دایاں پاؤں اُس دن گولی سے زخمی ہوا تھا اور اُسی دن سے وہ لنگڑا کے چلتا تھا۔ پھر اسے ڈھائی سال کی جیل بھی ہوئی تھی، مگر ڈھائی سال کی جیل بھی کیا ہوتی ہے؟ یونہی ہنستے کھیلتے جیل کی میعاد گزر گئی اور مکھن سنگھ واپس اپنے گھر آ گیا، اب پھر وہ ہنسی خوشی بڑے چین سے رہتا تھا، اُس کے دل پر کسی بات کا ملال نہ تھا، اُس کے کھیت زرخیز تھے، بیوی وفادار اور محنتی تھی۔

خود اُس کے دل میں واھگورو کا ڈر تھا۔ بس مکھن سنگھ کو اس کے علاوہ اور کیا چاہیئے۔

ہاں: ملک آزاد ہونے کے بعد لہنا سنگھ نے دوبارہ جو کھیتوں کا جھگڑا اٹھایا۔ اس سے ذرا وہ پریشان ہوا تھا۔ کیونکہ زیادہ پریشانی کی بات نہ تھی، ایک عدالت کا فیصلہ تو اُس کے حق میں تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ لہنا سنگھ نے کس بات کا سہارا لیکر اُس پر دوبارہ دعویٰ کیا ہے، وہ اپنی بیوی کو اس کے میکے چھوڑنے کے لیے پٹی کلاں گیا ہوا تھا کہ اُس کی غیر حاضری میں لہنا سنگھ نے مقدمہ دائر کر دیا۔ اور اُس کا سمن بھی نکال دیا اور پہلا سمن واپس بھی چلا گیا۔ کیونکہ مکھن سنگھ اپنے گاؤں میں موجود نہ تھا۔ جب وہ واپس آیا اور پڑوسیوں نے اسے بتایا کہ ایسا ایسا ایک سمن آیا تھا تو اُسے تشویش لاحق ہوئی۔ مگر مکھن سنگھ تو کسی بات کو دل پر لگانے والا آدمی نہ تھا، اُس نے بڑے آرام سے لسی کا چھنّا بھر کے پیا۔ ڈکار لے کر موچھوں کو تاؤ دیا اور لاٹھی اٹھا کر شہر کو چلا۔ دیکھوں تو عدالت کیا کہتی ہے۔

دوسرے دن صبح دس بجے ہی وہ عدالت میں پہنچ گیا۔ اس سے پہلے وہ صرف ایک بار عدالت میں آیا تھا جب لہنا سنگھ نے اس پر مقدمہ کیا تھا۔ مگر جب تو عدالت کی کرسی کے اوپر دیوار پر جارج پنجم کی تصویر آویزاں تھی اور اب اس کی جگہ ایک بڑے سنہرے فریم میں مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ مکھن سنگھ نے عدالت کے کمرے میں ذرا سا سر اندر ڈال کے

دیکھا۔ اور تصویر کو دیکھتے ہی دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور پھر آہستہ سے پیچھے ہٹ گیا۔ اور باہر کھڑے ہوئے چپراسی سے پوچھنے لگا۔

"ابھی عدالت صاحب نہیں آیا؟"

"نہیں گیارہ بجے آئے گا!" چپراسی نے بڑے تفاخر سے جواب دیا۔

"اچھا! اچھا!!" مکھن سنگھ نے بڑے مسکین لہجے میں کہا اور پھر سر جھکا کر اندر گھس گیا۔

عدالت کے کٹہرے کے نیچے کی میز پر پیشکار مثلیں دیکھ رہا تھا، وہ سوکھے چرخ رخساروں والا، لمبی ناک والا۔ گندی پگڑی والا پیشکار تھا۔ مکھن سنگھ نے اسے بھی دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ اور بولا۔

"مجھے مثل کی نقل چاہیئے۔"

"کونسی مثل کی؟"

"مکھن سنگھ نے نمبر تاریخ سب حوالے ٹھیک سے بتائے پیشکار نے اِدھر اُدھر کی مثلوں کو کھولا، ناک کھجائی، ران کھجائی۔ کھوپڑی کھجائی، آخر اِدھر اُدھر دیکھ کر ذرا تلخی سے بولا۔

"اس وقت مجھے پریشان مت کرو عدالت کا وقت ہو رہا ہے ڈیڑھ بجے آنا نکال کے رکھوں گا۔ ایں؟ سمجھے؟"

"جی سمجھ گیا!" مکھن سنگھ نے سر جھکا کے ہاتھ جوڑ کے کہا اور کمرے سے باہر ہو گیا۔ اور لاٹھی کا سہارا لے کر دیوار سے لگ کھڑا رہا۔ اسے عدالت کی کارروائی سننے کا تو شوق تھا نہیں، پھر اس کا کام تو ڈیڑھ بجے سے پہلے ہو نہیں سکتا، اور یہ بڑا نا شہر اس کا بچپن سے

دیکھا بھالا تھا۔ اب وہ جائے تو کہاں جائے۔ بس دیو ار سے لگ کر کھڑے رہنا ہی ٹھیک ہے۔

ٹھیک گیارہ بجے عدالت کا اجلاس شروع ہوا۔ گیارہ بجے تک عدالت کا کمرہ کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ وکیل لوگ کالے کالے گون پہنے ہوئے کبھی اٹھتے تھے کبھی بیٹھتے تھے، کبھی عدالت کو مخاطب ہو کر کچھ کہتے تھے جو مکھن سنگھ کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ تو صرف یہ جانتا تھا کہ سرسوں کیسے کھلتی ہے، اور کپاس کے پھولوں پر بہار کب آتی ہے اور گندم کے خوشے کس طرح کنواری حسیناؤں کی طرح اپنے حسن کے بارے خود بخود جھک جاتے ہیں اور اُس کی بیوی ہرے ہرے طوطوں کی ڈار کر دیکھتی ہوئی اپنے سر پر کھانے کا چھکا اور لسی کا چھنا رکھے کس طرح کھیتوں کی مینڈھ پر لچکتی ہوئی بل کھاتی ہوئی آتی ہے .....

کیا زندگی کے لئے یہ کافی نہیں ہے؟

بہت سوچ سوچ کے مکھن سنگھ نے جیل کی کوٹھری میں یہ فیصلہ کیا تھا۔ کہ بس اتنا ہی کافی ہے۔

مگر اب وہ یہ سوچ کر پریشان تھا کہ مثل کی نقل حاصل کر کے اسے اب ایک وکیل بھی کرنا پڑے گا، اور اُس کی سمجھ میں یہ بالکل نہیں آتا تھا کہ کیوں وہ عدالت سے صاف صاف نہیں کہہ سکتا۔ دیکھو جی! عدالت صاحب! یہ بات یوں ہے۔ یہ میرا کھیت یوں میرا ہے۔ یہ لہنا سنگھ کا نہیں ہے۔ اور فلاں عدالت صاحب نے فلاں وقت میں یوں فیصلہ دیا تھا۔

آپ وہ فیصلہ پڑھ لیجئے اور پڑھنے کی بات بھی اس میں کیا ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے وہ میرا کھیت ہے، خود لہنا سنگھ اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے، اگر یقین نہ ہو۔ تو خود لہنا سنگھ کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھ لو۔!

مگر یوں سوچنے کے بعد بھی، اُسے معلوم تھا کہ وکیل تو بالآخر کرنا ہی پڑے گا۔

جب ڈیڑھ بج گیا اور عدالت کا اجلاس لنچ کے لئے برخاست ہوا اور جب چند منٹوں میں سارا ہال خالی ہو گیا تو مکھن سنگھ پھر ڈرتے ڈرتے اندر گھسا۔ واہ گورو کی کرپا ہے کہ یہ مالی عدالت ہے فوجداری نہیں ہے جہاں اُسے ڈھائی سال کی سزا ہوئی تھی ....

وہ دھیرے دھیرے لنگڑاتا ہوا پیشکار کے پاس گیا۔ بولا۔

"وہ مثل کی نقل تیار ہے۔؟"

"ہاں تیار ہے۔ یہ لو!"

پیشکار نے مثل نکال کے مکھن سنگھ کے ہاتھ میں تھما دی مکھن سنگھ نے اپنی جیب سے دو روپے نکال کے پیشکار کے ہاتھ میں تھما دئے

پیشکار نے بُرا سا منہ بنا کے کہا۔ اوں ہوں۔ دو نہیں پانچ روپے ہوں گے! یہ کہہ کر اس نے مثل فوراً واپس لے لی۔

"مگر پہلے تو تم نے دو روپے لئے تھے لہنا سنگھ کے پہلے کیس یاں فرنگیوں کے زمانے میں!" مکھن سنگھ نے پوچھا۔

جب کی بات اور تھی، اب تو پانچ روپے لگیں گے۔ بابو کا فرمان ہے!"

بابوکا!" لکھن سنگھ حیرت سے بولا۔

"ہاں!" چالاک پیشکار فوراً بولا۔ "اگر مجھ پر اعتبار نہیں ہے تو اس تصویر کو دیکھ لو۔"

پیشکار نے ہاتھ کے اشارے سے دیوار پر لگی ہوئی گاندھی اور نہرو جی کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ یہ گاندھی اور نہرو کی وہی مشہور پرانی تصویر تھی جس میں دونوں نیتا ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس رہے ہیں اور گاندھی جی کا ہاتھ سمجھانے کے انداز میں اوپر اٹھا ہوا ہے اور اس ہاتھ کی پانچوں انگلیاں کھلی ہوئی ہیں۔

"دیکھ لو" پیشکار بولا "بابو کہہ رہے ہیں پانچ روپے ہوں گے پورے پانچ! سیدھے سادے کسان نے اس تصویر کی طرف دیکھا جو گویا اسے سمجھا سمجھا کر بتا رہی تھی ہاں اب تو پانچ ہونگے روپے پانچ۔ لچھمن سنگھ نے تصویر کی طرف دیکھ کر فوراً دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ اپنے تہمد کے ایک کونے سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا۔ پیشکار کے ہاتھ میں دیا اور مِسل کی نقل بغل میں داب کر سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گیا۔

جہاں ہوا نہ تھی

ھم ایک ٹیلے پر بیٹھے ہوئے سورج کی کرنوں سے جگمگاتی ہوئی وادی کو دیکھ رہے تھے۔ میرا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں تھا اور اُس کا سر میرے کندھے پر تھا۔ اور میرے دل میں ایک بُلبُل تھی اور اُس کی آنکھوں میں ایک نغمہ تھا۔ اور میں نے اُس سے پوچھا۔

"ہمارا بچہ کہاں ہے؟"

"سو رہا ہے!"

"کہاں؟"

"میرے خوابوں کے جھولے میں!"

"اسے جھولے سے باہر لے آؤ، اُسے یہاں کھیلنے دو۔ دیکھو یہاں گھاس کتنی ہری ہے، پھول کتنے شگفتہ ہیں، خوبانی کے پھل کتنے سنہرے ہیں ——!

"ہاں! یہ کُنج بہت خوبصورت ہے!" میری محبوبہ نے چاروں طرف

دیکھتے ہوئے کہا " گھاس ہری ہے۔ پھول شگفتہ ہیں۔ پھل سنہرے ہیں مگر ہوا نہیں ہے۔"

" ہاں " میں نے قدرے افسردگی سے کہا " یہاں ہوا نہیں ہے "

" اور بچہ ہوا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا " وہ بولی "

" تم ٹھیک کہتی ہو " میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

" اور یہاں اور کوئی بچہ بھی نہیں ہے جس سے وہ کھیل سکے۔"

" ہاں " میں نے خوبصورت لیکن سنسان وادی کی طرف دیکھ کر کہا " ارے تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ یہاں تو کوئی دوسرا بچہ بھی نہیں ہے۔ ہمارا بچہ کس کے ساتھ کھیلے گا "

چند لمحوں تک مکمل سکوت رہا، سنسان وادی میں جیسے دھوپ کی خوشگوار لہریں سی اٹھ رہی ہوں جیسے گھاس نے اُن پر اپنا بچھونا بنا لیا ہو اور سو گئی ہو۔ درختوں کے پتے بھی جیسے ایک دوسرے کی بانہہ پر سر ٹیکے اونگھ رہے ہوں، دھوپ، آرام، غنودگی، میں نے دھیرے سے اپنی محبوبہ کو کھینچ کر لپٹا لیا۔ اور اس کے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ ملا دیئے اور آنکھیں بند کرلیں اور وقت اور زندگی اور جسم کے سارے فاصلے مٹ گئے۔

چاروں طرف خاموشی تھی دل کے دھڑکنے کی صدا بھی نہ آتی تھی صرف کبھی کبھی میری پلکیں اُس کی دراز پلکوں سے الجھ کر کانپنے لگتی تھیں۔

صدیوں کے بعد ہم جاگے اور میں نے گھبرا کر اُس سے پوچھا " ہمارا بچہ کہاں ہے ؟"

وہ میلے میں گیا ہے !

"کہاں گیا ہے؟"

اُس نے پہاڑوں کی سب سے اونچی چوٹی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔" وہ وہاں گیا ہے۔ جہاں کی چوٹی سب سے اونچی ہے، جس پر برف پڑی ہے، جہاں بادل ہیں اور بچوں کا میلہ ہے"

"کیا سب بچے وہاں گئے ہیں؟"

"ہاں"

"وہ لوگ وہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"وہ لوگ ہوا کو بلانے گئے ہیں"

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو، یہاں سب کچھ ہے۔ مگر ہوا نہیں ہے۔ میں نے افسردگی سے سر ہلا کر کہا اور اس کا ہاتھ زور سے پکڑ کر پوچھا کیا ہوا یہاں کبھی آئے گی؟

"کہہ نہیں سکتی" میری محبوبہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ اور اپنے بالوں کی ایک آوارہ لٹ کو سنبھالتے ہوئے کہنے لگی۔ کبھی کبھی اس وادی میں ہوا آتی ہے اور ساری وادی برف کے گالوں سے اَٹ جاتی ہے۔ درختوں کے پتے گر جاتے ہیں اور بچوں کے ننگے پاؤں پھٹ کر خون سے رِسنے لگتے ہیں اور وہ کسی تاریک کھوہ میں پناہ لیتے ہوئے برفیلے بے رحم طوفان کی گرج سُن کر سہم جاتے ہیں"

نہیں میں اُس ہوا کی بات نہیں کرتا"

تو جب ہوا کی تم بات کرتے ہو" میری محبوبہ اپنا ہاتھ مجھ سے چھڑاتے ہوئے بولی۔ وہ بھی یہاں کبھی کبھی آتی ہے، اور ہماری وادی گرم ریت سے بھر جاتی ہے، اور ہری ہری گھاس کی ساری جڑیں سوکھ جاتی ہیں۔

اور پانی لاوے کی طرح کھولتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور بچوں کی زبانیں نکل کر باہر آجاتی ہیں - اور وہ ٹھنڈے پانی کی ایک بوند کے لئے ہانپتے ہوئے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے دھرتی کا سینہ کریدنے لگتے ہیں -

" نہیں میں اس ہوا کی بات بھی نہیں کرتا "

" تو تم جس ہوا کی بات کرتے ہو اُسے لانے کے لئے ہی تو بچے افق پر گئے ہیں "

" کیا ہوا آئے گی ؟ " میں نے محبوبہ سے پوچھا، اُس کے ہونٹوں سے پوچھا۔ اُس کے بالوں سے پوچھا۔ اس کے دھڑکتے ہوئے سینے سے پوچھا اور جو جواب مجھے ملا اسے سن کر میں خوفزدہ ہوگیا، خاموش رہ گیا -

" تم بھی ڈر گئے؟ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا -

" ہاں ؟ "

" اس وادی میں ہر شخص خوفزدہ ہے وہ ہوا آئیگی یا کوئی دوسری ہوا آجائیگی ؟ "

" کوئی دوسری ہوا ؟ "

" ہاں " میری محبوبہ بولی " کچھ لوگ کہتے ہیں اب کے جو ہوا آئے گی وہ سب سے تند اور وحشی اور ظالم ہوگی اور وہ ہوا نہ ہوگی جسے بچے لانے کے لئے گئے ہیں وہ ہوا وادی کا سینہ چیر کے رکھ دے گی، اُس کے پہاڑوں کو سرمہ بنادے گی، جہاں درخت ہیں وہاں جلتی ہوئی چٹانیں ہوں گی، جہاں انسان ہیں وہاں چٹختی ہوئی ہڈیاں ہوں گی -

اور میں تمہیں چوم نہ سکوں گا اور تمہارے بالوں سے کھیل نہ سکوں گا، اور تمہاری آنکھوں میں اپنے سپنے دیکھ نہ سکوں گا "

"نہیں اور میں بھی اس طرح تمہارے تسلانے سے لگ کر سکھ کا سانس نہ لے سکوں گی۔ !"

میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے تکلیف دہ لہجہ میں کہا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو یہاں ہوا نہیں ہے! میں بھی ہوں، تم بھی ہو، پھول بھی ہیں، گھاس بھی ہے، خوبانی کے پھل بھی ہیں۔ مگر ہوا نہیں ہے..."

ہم دونوں چپ رہے دیر تک ایک بے نام سی گونج ہمارے دماغ میں بھنبھناتی رہی یکایک وہ گھبرا کر بولی۔

"میرا بچہ! میرا بچہ!!

"کیا آ گیا؟"

"نہیں وہ مجھے دکھائی نہیں دیتا۔"

"کیا پہلے دکھائی دیتا تھا؟"

"ہاں۔ مگر اب وہ دکھائی نہیں دیتا۔ اب تو مجھے وہ چوٹی بھی دکھائی نہیں دیتی!" وہ گھبرا کے بولی اور اس کی نیلوفری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "یہ ٹیلہ بہت چھوٹا ہے، یہاں سے کچھ نظر نہیں آتا آؤ۔ اس دوسرے بڑے اور اونچے ٹیلے پر چلیں۔ شاید وہاں سے تمہیں بچہ نظر آ جائے گا!"

وہ ٹیلہ بہت اونچا تھا اور راستہ بہت کٹھن تھا تو بھی ہم گرتے پڑتے ایک دوسرے کو سنبھالتے کسی طرح وہاں پہنچ گئے اور جاتے ہی تھک کر اور مایوس ہو کر بیٹھ گئے، کیونکہ یہاں سے بھی وہ چوٹی نظر نہ آتی تھی جہاں بچوں کا میلہ تھا، یہاں سے ساری وادی نظر آتی تھی، بیچ گلہری کی طرح مچلتی ہوئی ندی اور کندھوں پر فصل کی بالیاں اٹھائے ہوئے شوخ

پشنگ لڑکیوں کی طرح ہنستی ہوئی کھیتیاں، گھاٹوں پر معبد گاہوں کی طرح ایستادہ سبز مینار اور شاہ بلوط کے گھنیرے گنبد، اور ان سب کے اوپر وہ خوبصورت چوٹی! مگر چوٹی پر بادل گھر آئے تھے اور وہ ساری کی ساری بادلوں سے ڈھکی ہوئی تھی!

"میرا بچہ!" وہ گھبرا کر بولی اور تأسف سے ہاتھ ملنے لگی۔

"میں نے اسے کیوں وہاں بھیج دیا۔؟"

"گھبراؤ نہیں ہمارا بچہ وہاں اکیلا نہیں ہے اس میلے میں اور بہت سے بچے ہوں گے ہمارے خوانوں کے بچے بڑے بہادر ہیں۔!"

مگر میری محبوبہ کو میری باتوں کا اعتبار نہ تھا، اس نے سر جھکا لیا اور دھیرے دھیرے سسک سسک کر رونے لگی۔ یکایک میں نے چوٹی پر کچھ دیکھا اور میں نے خوشی سے چلا کر کہا دیکھو... وہ دیکھو!

ایکدم چونک کر اور سر اٹھا کر جو میری محبوبہ نے چوٹی کی طرف دیکھا تو اس کی آنسو بھری آنکھوں میں مسرت کی چمک آگئی۔

دیکھو دیکھو" میں نے مسرت سے بھرپور لہجے میں کہا "وہ سات رنگوں والی قوس قزح!

"وہ خوشی سے بولی "یہ سات رنگوں والی قوس قزح نہیں ہے۔ یہ ہمارے بچوں کا جھنڈا ہے"

"اور یہ شور تم سنتی ہو، جو بادلوں کے پیچھے چوٹی سے آ رہا ہے؟"

"یہ شور نہیں ہے" وہ خوشی سے بولی "یہ ہمارے بچوں کا گیت ہے!"

"کیا یہ ہوا لے کر آئیں گے؟" میں نے اپنی محبوبہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا، مگر ہم دونوں چوٹی کی طرف دیکھنے لگے اور ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس وادی میں کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے جہاں ہوا نہ تھی۔!

ٹیڑھی میڑھی بیل

لکڑی کے گملے میں جس پر پیلے رنگ کا چمکدار وارنش تھا نیلا دھاری کی بیل پھوٹ آئی تھی۔ نیلا دھاری کی بیل بہت جلد بڑھتی ہے شفاف دھاگوں کی طرح اس کی سینکڑوں تو باہیں ہوتی ہیں جو کھڑکی سے نکل کر چھت کو پکڑ لیتی ہیں اور چھت پر سے کسی ٹیلے کی طرح گھومتی ہوئی برآمدے کے چھجے تک پہنچ کر باہر کی کھلی ہوا اور دھوپ کا نظارہ کرتی ہیں۔ نیلا دھاری کی بیل میں پتے بہت کم ہوتے ہیں صرف موسم گرما میں چھوٹے چھوٹے پتے پھوٹتے ہیں اور اُن میں ہلکے نیلے رنگ کے سے پھول لگتے ہیں۔ پتوں میں خوبصورتی نہیں ہوتی، پھولوں میں خوشبو نہیں ہوتی دیکھنے میں بھی وہ بیمار سے لگتے ہیں۔ نیلا دھاری کی بیل میں سب سے خوبصورت اس کی باہیں ہیں۔ سینکڑوں شفاف دھاگوں کی طرح مہین اور بل کھائی ہوئی باہیں جو کمرے کی کھڑکی سے چل کر چھت کا اندرونی حصہ طے کر کے برآمدے کے چھجے تک پہنچ جاتی ہیں۔ کیونکہ ہر لحظہ کھلی ہوا اور دھوپ

چاہتاہے۔ اس کے علاوہ نیلا دھاری کی بیل کو بہت جھکنا پڑتا ہے۔ اپنی بانہوں کو ٹیڑھا میڑھا کرکے آگے کو جھکنا پڑتا ہے۔ مگر کیا کرے۔ اس کی خوراک کو تو کھلی ہوا کی نمی اور سورج کی کرن کی ضرورت ہے جس کے بغیر ہرے پتّوں والی لانبے لانبے سبز ڈنٹھلوں اور دھاگوں کی طرح مہین بیلوں والی نباتات کی زندگی ناممکن ہے، اس لئے وہ ہر ممکن کوشش کرکے سورج کی کرن تک پہنچتی ہے، اس لئے مجھے نیلا دھاری کی بیل بہت پسند ہے، اسلئے یہ میری میز کے سامنے کی کھڑکی کے گلے میں لٹکی ادھر ادھر جھولتی رہتی ہے، دیکھنے میں بڑی نازک سی بیل ہے، لیکن اس کے اندر زندہ رہنے کی قوت کس شدت سے پائی جاتی ہے۔ اس کی کاوش پیہم سے میرے ذہن کو بڑی آسودگی عطا ہوتی ہے زندگی کے تھکے ہارے لمحوں میں جب میں اس بیل کو دیکھتا ہوں تو اپنے دل کے اندر ایک عجیب مضبوطی سی پاتا ہوں۔

- - - - - - -

میں ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ کے کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ میں لیبارٹری اسسٹنٹ ہوں تعلیم M-S-C تک پائی ہے۔

لیبارٹری اسسٹنٹ کے کام کے علاوہ میں پروفیسر دھرم سی کے ساتھ ریسرچ بھی کرتا ہوں، آجکل ہم لوگ کیمیاوی طور پر پروٹین بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ پروٹین کے بارے میں تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ انسانی غذا کا ایک اہم جزو ہے۔ ہم لوگ اگر کیمیاوی طور پر پروٹین بنانے میں کامیاب ہو گئے تو انسانی غذا میں ایک انقلاب لانے کے ذمہ دار ہوں گے۔ چونکہ ہر شخص روز کھانا کھاتا ہے اور پروٹین اس کے لئے

ضروری بھی ہے، اس لئے ایجاد میں آپ بھی ضرور دلچسپی لیں گے ۔ یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے ، اگر ایک پتہ ایک چھوٹے سے چھوٹا پتہ سورج کی کرن کو اپنی خلیوں میں مقید کر کے اس پر فوٹو سنتھسس کے عمل سے اُس میں سے اپنی خوراک حاصل کر سکتا ہے تو ہم لوگ جو پتے سے کہیں زیادہ پیچیدہ مربوط اور اعلیٰ سطح کی زندگی رکھتے ہیں ہم لوگ کیوں کیمیاوی طور پر غذا ابھی نہیں بنا سکتے ۔ سیاسی نظریوں کا میں نے بہت گہرا مطالعہ تو نہیں کیا ہے لیکن اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب تک ہم لوگ کیمیاوی طور پر غذا بنانے میں کامیاب نہیں ہو جاتے ایک عالمگیر پیمانے پر ہم اس دنیا سے بھوک کو ختم نہیں کر سکتے ۔ معاف کیجئے گا آپ کسی بھی سیاسی نظریئے میں یقین رکھتے ہوں لیکن مجھے یہ کو آپریٹو کاشتکاری ہو یا اجتماعی کاشتکاری چاہے وہ ٹریکٹروں کی مدد سے کیوں نہ کی جائے بے حد غیر متمدن ، غیر مہذب اور زمانۂ جاہلیت کی حامل معلوم ہوتی ہے ۔ ذرا سوچیئے تو ۔ ایک ذرا تمام سیاسی نظریوں سے بلند ہو کر ایک لمحے کے لئے وسیع القلبی سے ذرا سوچیئے تو ۔ تو کسان کی زندگی چاہے وہ ہل چلائے یا ٹریکٹر اپنے پورے عمل میں کس قدر دقیانوسی اور وحشیانہ اور غیر متمدن معلوم ہوتی ہے ذرا خیال تو کیجئے اس کرۂ ارض کے شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک ایک ایک انچ چپہ زمین کو جو کاشتکاری کے قابل ہے ہل سے جوت کر تیار کیا جاتا ہے ، پھر اس میں بیج بویا جاتا ہے ، پھر پانی دیا جاتا ہے ، پانی کی نہر نہ ہو تو آسمان کی طرف دیکھا جاتا ہے ۔

فصل اُگتی ہے تو ٹڈی دل کا خطرہ ہوتا ہے، فصل پک جاتی ہے تو بنئے کا زمیندار کا، جاگیردار کا خطرہ ہوتا ہے، یہ سب نہ ہوں تو سرکار اپنا حصہ لے جاتی ہے اور چھ مہینے کی اس مسلسل کاوش کے بعد کسان کے ہاتھ جو آتا ہے وہ نو مہینے کے بعد ایک نیا بچہ پیدا ہو کر برابر کر دیتا ہے یہ کھادیں، کھاد کے کارخانے بھی کہاں تک فصل کی پیداوار کو بڑھا سکتے ہیں۔ جس سرعت سے انسانی آبادی اس کرۂ ارض پر بڑھ رہی ہے اُس شرح سے اناج کی فصل نہیں بڑھ سکتی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جب تک کیمیاوی طور پر غذا تیار کرنے کے طریقے معلوم نہ ہوں گے اس دُنیا سے بھوک ختم نہ ہوگی، آپ چاہے کوئی بھی سیاسی نظریہ انسان کے سر پر لاد دیں۔ مثال کے طور پر آپ خود سوچئے اگر بوٹ فیکٹری میں تیار کرنے کے بجائے درختوں پر اُگتے تو آپ کو ایک بوٹ خریدنے کے لئے کس قدر غیر یقینی حالات میں سے گزرنا پڑتا۔

اگر ہم لوگ کیمیاوی طور پر سلک کا دھاگا نہ بنا لیتے یا ریان اور نائیلان اور پلاسٹک کی کھادی طور پر تعمیر نہ کرتے تو صرف ریشم کے کیڑوں یا روئی کے پودوں پر آپ کب تک انحصار کر سکتے تھے کہ وہ ساری انسانی آبادی کے لباس کی ضروریات کو پورا کر سکیں؟

اس لئے ہم لوگ پروٹین بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اور جس روز ہم نے کیمیاوی طور پر پروٹین تیار کر لیا جانوروں کو ذبح کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ ہم لوگ کیمیاوی طور پر تیار کیا ہوا گوشت فیکٹری میں تیار کر کے آپ کو دیں گے، نہ صرف گوشت بلکہ نشاستہ، چربی، تیل، کاربوہائیڈریٹس اور دوسرے غذائی اجزاء بھی کارخانے میں اس طرح تیار کر کے دیں گے

جس طرح آج ہم وٹامن تیار کر کے دیتے ہیں، پھر ذرا سوچئے ــ تو یہ زراعت کا مسئلہ کس آسانی سے حل ہو جائے گا۔ ملک میں چالیس پچاس خوراک کے کارخانے لگا لیئے اور پورے ملک کی غذائی ضرورت کو پورا کر لیا، اُسی وقت کسان صحیح معنوں میں ہل کی غلامی سے چھوٹ جائے گا اور شہروں اور دیہات کا امتیاز دور ہو سکے گا۔ اس سے پہلے آپ کچھ بھی کیجئے معاملہ وہی رہے گا۔ ہر نظریاتی انقلاب سے پہلے، سائنسی انقلاب بے حد ضروری ہے!

پروفیسر دھرم سی اور میں آجکل اِسی مسئلہ پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ مجھے لیبارٹری ساڑھے نو بجے ہی پہنچ جانا چاہیئے، اِس لئے میں گھر سے ساڑھے آٹھ بجے ہی چل دیتا ہوں۔ پروفیسر دھرم سی تو گیارہ بجے آتے ہیں۔ مگر اُن سے پہلے پہنچ کر مجھے بہت سا سامان اُن کے لئے تیار کر کے رکھنا ہوتا ہے۔ اِس لئے روزمرّہ کی طرح میں نے جلدی جلدی فولادھاری کی بیل کو پانی دیا اور لکڑی کے گملے کو کھڑکی میں ٹانگ کر بس کے اڈّے کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلی دو بسوں میں تو کوئی جگہ نہ تھی، آدھ گھنٹہ یہ ضائع ہو گیا۔ خیر تیسری بس میں جگہ مل گئی، میرے ساتھ کی سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت بیٹھی تھی۔ بڑا متفکر لیکن پیارا سا چہرہ جیسا کہ ہماری ماؤں کا ہوتا ہے۔ آپ کسی بھی ماں کا چہرہ دیکھیئے دکھ کی لہر کے ساتھ جوہر تخلیق کے ساتھ جاتی ہے۔ آپ اُس کے چہرے میں ایک عجیب قسم کی خود اعتمادی اور اپنے آپ میں ڈوبی ہوئی کیفیت جو آپ کو تحقیقی سائنس داں کے چہرے پر ملے گی۔ عورت بھی دراصل تخلیق کرتی ہے اور اپنے جسم میں ایک

پیچیدہ لیبارٹری لئے گھومتی ہے، اس لئے میں اُس مرد کو مہذب نہیں سمجھتا جو عورت کی عزت نہیں کرتا ہے اُس سماج کو بھی میں بہت وحشی اور غیر متمدن گردانتا ہوں۔ جہاں عورت کا درجہ پست ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا ہے جس سے آپ کسی بھی سماج کو پرکھ سکتے ہیں، اُن کی لچھے دار باتوں میں مت جائیے، لچھے دار فلسفے سے بھی مرعوب مت ہوئیے۔ عمل میں دیکھئے عورت کا درجہ کیا ہے؟ وہاں پر! وہیں سے پہچان ہو جائے گی، اُس فرد کی یا اس سماج کی!

ساتھ والی سیٹ پر جو عورت بیٹھی تھی اُسے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ سانتا کروز میں اُس کے خاوند کی فرنیچر کی ایک چھوٹی سی لیکن عمدہ دوکان تھی فرنانڈیز بہت عمدہ بڑھئی تھا۔ بہت اچھا فرنیچر بناتا تھا اور بکفایت بیچتا تھا۔ اُس کے گاہک پُرانے اور کئی سالوں سے چلے آرہے تھے اور کسی قیمت پر اُسے چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔

فرنانڈیز نے بہت بُرے دن دیکھے تھے وہ گوانی عیسائی تھا اور بہت بُری حالت میں بمبئی آیا تھا۔ یہاں آکر اس نے محمد علی روڈ پر سلیمان جی مٹھا کی عالیشان دوکان پر فرنیچر بنانے کا کام سیکھا اور کچھ عرصے کے بعد جب مہارت حاصل کرلی تو اپنی ایک دوکان سانتا کروز میں جمالی، پھر اُس نے شادی کی، پھر اُس کے پانچ بچے بھی ہوئے پھر وہ ایک روز ٹیٹس کا شکار ہو کے چل بسا۔ تھوڑا تھوڑا کرکے فرنانڈیز سے میں نے بھی بہت سا فرنیچر خریدا تھا اس لئے میں اُسے اچھی طرح جانتا تھا۔ میں اُس کے جنازے میں بھی شریک ہوا تھا۔ دو تو اس کے بڑے بچے تھے، ایک میٹرک میں پڑھتا تھا اور سب سے

چھوٹی دو لڑکیاں تھیں جو کھار کے مشن سکول میں دوسری یا تیسری میں پڑھتی تھیں۔ فرنانڈیز خود پڑھا لکھا نہ تھا اسلئے وہ اور بھی چاہتا تھا کہ اُسکی اولاد خوب پڑھ لکھ جائے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں اُس نے یہ غلطی ضرور کی کہ اس نے اپنے کسی بیٹے کو بڑھئی کا کام نہیں سکھایا ورنہ اُس کے مرنے کے بعد اس کی دوکان یوں دو مہینوں میں نہ اُجڑ جاتی۔ دوکان میں جتنا فرنیچر تھا گھر والوں نے بیچ کر کھا لیا۔ پھر بڑے دو لڑکوں نے سکول چھوڑ دیا اور نوکری ڈھونڈھنے لگے۔ جب نوکری کہیں نہ ملی تو تو جیب کاٹنے اور چاقو مارنے اور کوکین لانے کا دھندہ کرنے لگے اور تھوڑے ہی دنوں میں ریفارمیٹری بھیج دیئے گئے۔ ریفارمیٹری کی دنیا سے سدھر کر نکلے تو باہر کی دنیا میں وہی پرانا غلیظ ماحول ملا۔ اس لئے پھر وہی کام کرنے لگے اور بڑا لڑکا ڈیڑھ سال کے لئے اور چھوٹا لڑکا چھ ماہ کے لئے اندر ہو گیا۔ جب تک باہر کی فضا نہ سدھرے ریفارمیٹری کہاں تک بچّوں کے کیرکٹر کو سدھار سکتی ہے۔ اگر ہوا میں آکسیجن ہو گی تو لوہے کو زنگ تو ضرور لگے گا۔ جانے یہ لوگ — میرا مطلب سیاستدانوں سے ہے اتنی سی بات بھی کیوں نہیں سمجھتے۔!

°

x x x x x

میں نے مسز فرنانڈیز سے پوچھا، آپ ادھر یہاں کہاں آئی تھیں ارلا روڈ پر؟ مسز فرنانڈیز کی سانس پھولی ہوئی تھی اور وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھیں۔ بولیں دونوں بچیوں کے امتحان قریب ہیں اور امتحان سے پہلے مجھے چھ ماہ کی فیس داخل کرنا ہو گی۔ پھر اب لڑکے

کی فیس بھی ہے۔ وہ اب ساتویں جماعت میں ہے اور بے حد شریف بچہ ہے، کلاس میں ہمیشہ اول یا دوم رہتا ہے، استاد اس کی بہت تعریف کرتے ہیں — میں یہاں اپنی ایک —— ایک سہیلی سے قرض مانگنے آئی تھی — اسی روپوں کی ضرورت تھی اور آپ جانتے ہیں خاوند کے مرنے کے بعد میری کیا حالت ہو گئی ہے، دونوں بڑے بچے نالائق نکلے، ان سے بڑی امیدیں تھیں مگر اب مجھے خود کو سب کچھ کرنا پڑتا ہے، اور میں پڑھی لکھی بھی نہیں ہوں، بڑھئی کا کام بھی نہیں جانتی، لیکن گھر بھی ہے۔ بچوں کی پڑھائی ہے، کتابیں ہیں کپڑے لتے ہیں، دو وقت کا دوزخ بھی ہے۔ بڑی مشکل زندگی ہے کیا کروں؟ کیا نہ کروں؟

مسز فرنانڈیز کا گول گول چہرہ زرد تھا، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے، اس نے اپنے بالوں کی ایک لٹ کو کان کے گرد گھماتے ہوئے کہا۔

”میں تو اگلے سٹاپ پر اتر جاؤں گی۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟

”اپنا تو ایک ہی اڈہ ہے ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ۔ صبح سے شام تک سائنس کے آلات و تجربے!

”بہت اچھا ہے، اکیلے ہو اور تجربے کرتے ہو، اس ملک میں تو بال بچے والوں کی موت ہے، سمجھ میں ہی نہیں آتا دو وقت کی روٹی کیسے مہیا کی جائے گی۔

مسز فرنانڈیز نے اپنے پھٹے ہوئے فراک کے ایک سوراخ کو چھپاتے ہوئے کہا۔

اگلے سٹاپ سے پہلے پولیس کا چیک ناکہ آتا تھا۔ یہاں پر آکر بس کھڑی ہوگئی۔ اور پولیس اندر گھس آئی ... کو گھورنے لگی اور مشتبہ ا... سامان کی تلاشی لینے لگی۔

مسز فرنانڈیز اور میں دونوں اس تفتیش سے بے تعلق اور بے نیاز ہو کر ماہم کا زوبے کے سمندر کو دیکھنے لگے۔

پولیس کی عورت ہماری سیٹ کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

" اے بائی " اس نے بڑی کرخت آواز میں مسز فرنانڈیز کو مخاطب کیا۔

ایک اضطراری حرکت سے مسز فرنانڈیز کا ہاتھ اپنے پھٹے ہوئے فراک کے سوراخ پر گیا۔ جیسے وہ اپنی غریبی کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔

" کیا ہے ؟" مسز فرنانڈیز نے پولیس کی عورت سے پوچھا۔

" پولیس کی عورت نے اُس سوراخ سے شاید جھانک لیا تھا اُس نے غصہ میں آکر مسز فرنانڈیز کا فراک ہنڈلیوں تک الٹ دیا میں نے بھی اور بس کے دوسرے مسافروں نے بھی دیکھا مسز فرنانڈیز کی پنڈلیوں پر سائیکل کی ربڑ ٹیوبیں بندھی ہوئی ہیں۔

" ان میں شراب ہے کیا ؟"

" نہیں تو " مسز فرنانڈیز نے بڑی کمزور آواز میں انکار کیا، لیکن اس کا اُڑا اُڑا رنگ، اس کا معصوم مجرم چہرہ، اس کا پھولا ہوا سانس سب کچھ کہے دیتا تھا۔

" نیچے اترو " پولیس کی عورت فتحمند لہجے میں بولی۔

مسز فرنانڈیز وہیں سیٹ پر بیٹھی تھی، اُس نے اٹھنے کی

بہتیری کوشش کی، لیکن غالباً اُس کی ٹانگیں جواب دے گئی تھیں پولیس کی عورت نے اسے ٹھوکے دے کر اُسے بے عزت کر کے بس سے نکالا۔ مسز فرانسیز کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ اُس میں بھی شراب کی بوتلیں پکڑی گئیں، اس کے ہاتھ پاؤں بُری طرح کانپ رہے تھے۔

جب بس چلی تو وہ رُندھے ہوئے گلے سے کہہ رہی تھی۔

"میرا خاوند، پانچ بچے، سکول کی فیس، روٹی۔ میں، سنو پہلی بار لائی ہوں، میرے بچے سکول نہ جاسکیں گے، کہاں سے وہ کھائیں گے ہے۔ رحم۔"

اُس کا وہ گول مٹول بے بس جذبات سے مجروح چہرہ ممتا کے خون میں مغلوب چہرہ، سارا دن مجھے پریشان کرتا رہا میں شراب کے حق میں نہیں ہوں، شراب بندی سے مجھے کوئی خاص پرخاش نہیں ہے۔ لوگوں کے کردار میں بھی بلند کرنا چاہتا ہوں لیکن سماج کے کردار کو بلند کئے بغیر یہ سب کچھ کیسے ہوگا۔ جب فرانسیز زندہ تھا تو ایک دفعہ میں اس کے گھر گیا تھا جو سو کے کنارے سینٹ ٹھریسا کالونی میں اس کی چھوٹی سی خوشنما کاٹیج تھی۔ اُس کے بچے ابھی سکول سے آئے ہی تھے اور مسز فرانسیز پھولدار اور گندمی کا ایک خوشنما فراک پہنے اپنے بچوں کو چائے اور بسکٹ پلا رہی تھی، کس قدر خوبصورت اور خوشبو بھرا گھر تھا وہ اور کس محبت اور اصرار سے اس نے مجھے چائے پلائی تھی۔ ایسا گھر جس کے گوشے گوشے سے دیانتداری اور محنت کی خوشبو آتی تھی اور آج وہ پانچ بچوں کی ماں چیک ناکہ پر حیران و پریشان کھڑی تھی اس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی اور اس کے فراک کے نیچے

اُس کی پنڈلیوں سے ربڑ ٹیوبیں سانپ کی طرح بل کھائے ہوئے اُسے پکڑے کھڑی تھیں۔

"بہت آسان ہے اس عورت کو سزا دیکر جیل میں بھیجدینا اور غالباً اس کے ساتھ یہی کیا جائے گا۔ لیکن کیا اس طرح یہ سوال حل ہو جائیگا؟ پھر اس سانپ کا کیا ہوگا؟ اور اس زہر کا کیا ہوگا؟ اور اس ضرورت کا کیا ہوگا۔ جس نے مریم کے ہاتھ میں شراب کی بوتل دے کر اسے چیک ملکے پر کھڑا کر دیا ہے؟"

میں دن بھر لیبارٹری میں یہی سوچتا رہا۔ آج کام میں بہت گڑبڑ ہو گئی۔ اور پروفیسر دھرم سی نے دو تین مرتبہ مجھے حیرت سے دیکھا۔ پھر ایک مرتبہ بہت ہی پیار سے سرزنش بھی کی لیکن میرا سائنس داں کا دماغ مسز فرانہ یزکی الجھن کو حل کرنے میں لگا رہا اور کسی کام میں جی نہ لگتا۔ ذہنی طور پر مجھے غیر حاضر پاکر پروفیسر دھرم سی نے مجھے آج جلدی چھٹی دے دی۔ اور میں سرِ شام گھر آ گیا۔ ورنہ اس سے پہلے کبھی رات کے دس بجے سے ادھر آنا نصیب نہ ہوتا تھا۔

گھر پہنچ کر میں نے دروازہ کھولا، اپنا کمرہ کھولا، اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی تو مجھے لنگوڑی کے گملے میں نیلا دھاری کی ٹیڑھی میڑھی شاخیں کھڑکی سے برآمدے کی چھت تک جھولتی نظر آئیں۔

اُسے دیکھ کر یکایک مجھے مسز فرنانڈیز کے سوال کا جواب مل گیا۔ میں آہستہ سے مسکرایا، میں نے دھیرے سے نیلا دھاری

کے گملے کو کھڑکی کے ٹہک سے الگ کیا اور اُس سے باہر برآمدے کے چھجے پر لٹکا دیا۔ جہاں سے نیلا دھاری کی شاخوں کو براہ راست ہوا اور سورج کی دھوپ میسر ہو سکتی تھی۔

دوسرے دن نیلا دھاری کی بیل سے جو شاخ پھوٹی وہ بالکل سیدھی تھی اور اس کا رُخ آسمان کو تھا۔



چوراہے کا کنواں!

میرا بچہ بیمار تھا۔ میرا خیال تھا وہ مر رہا ہے، لوگوں نے کہا اگر تم اسے چوراہے کے کنویں پر لے جاؤ اور اُس کنویں کا ایک گھونٹ پانی اس کے حلق میں اتار دو تو تمہارا بیٹا بچ جائے گا۔

"میں نے پوچھا چوراہے کا کنواں کہاں ہے؟
وہ بولے:۔ "وہ کہیں نہیں گاؤں میں ہے"
"کہیں نہیں گاؤں کہاں ہے؟ میں نے پوچھا"
ہمارے گاؤں کے سب سے بڑھے وئیدنے کہا۔

"تم یہاں سے وہاں جاؤ۔ وہاں سے جہاں جاؤ، جہاں سے تہاں جاؤ، اور جب تم تہاں پہنچو گے تو وہاں سے کہاں کو مڑ جاؤ۔ بالکل سامنے تمہیں کہیں نہیں گاؤں ملے گا۔ اس کے وسط میں چوراہے کا کنواں ہے!

میں نے وئید کا شکریہ ادا کیا۔ بچے کو اپنی گود میں اٹھایا اور اپنے گاؤں سے باہر نکل کھڑا ہوا۔

"میں یہاں سے وہاں گیا۔ وہاں سے جہاں گیا، جہاں سے نہاں گیا۔ اور تہاں سے پہنچکر میں جب کہاں کو مڑا تو مجھے اپنے سامنے چار سڑکیں نظر آئیں۔

ایک لال سڑک تھی۔
ایک نیلی سڑک تھی
ایک کالی سڑک تھی
ایک سفید سڑک تھی

اور ان چاروں سڑکوں کو کاٹتے ہوئے دائرے کی شکل میں کہیں نہیں گاؤں آباد تھا۔ اور اس گاؤں کے وسط میں چوراہے کا کنواں تھا۔

چوراہے کے کنویں پر بہت سے لوگ جمع تھے، مرد اور عورتیں بڈھے اور بچے بہت سے لوگ جمع تھے، ایک میلہ سا لگا تھا اور ان لوگوں میں ایک دراز قد سفید ریش بڈھا اِدھر اُدھر گھومتا ہوا بے حد وجیہہ لو پرُوقار معلوم ہوتا تھا۔ ہر شخص اس کو تعظیم دے رہا تھا۔ اور بڈھا تعظیم لیتے ہوئے بڑے شاعرانہ انداز میں اپنے بازوؤں کو اوپر نیچے گھماتا تھا۔ ایسی شاعری جو صرف پھلدار شاخوں میں ہوتی ہے۔

بڈھے نے مجھ سے پوچھا "تم اس گاؤں میں اجنبی ہو؟"
میں نے تعظیماً سر جھکا دیا۔
"بڈھے نے پوچھا۔ "تم کہاں سے آئے ہو؟"
"میں نہیں کہیں گاؤں سے آیا ہوں۔ میرا بچہ بیمار ہے

اور وئیدجی نے کہا ہے، اگر میں اپنے بچے کو، جو رہا ہے کے کنویں کا ایک گھونٹ پانی پلادوں تو میرا بچہ بچ جائے گا۔"!

"پانی سے کیا ہوگا؟" بڈھے نے بڑے مایوس لہجے میں پوچھا۔

"پانی میں بڑی طاقت ہے بابا!"

"آگ میں بڑی طاقت ہے بیٹے!"

"آگ اور پانی دو ہی بڑی طاقتیں ہیں بابا۔ آگ جو انسان کے دل کے اندر رہے۔ پانی جو اس کی آنکھ میں ہے، جس کام کو آگ پورا نہیں کرسکتی اسے پانی پورا کر دیتا ہے۔ ایسا وئیدجی نے کہا تھا"

بڈھا میری بات سن کر مسکرایا۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"تمہارے گاؤں کا وئیدبڑا سمجھدار معلوم ہوتا ہے، مگر افسوس اس وقت تمہیں اس کنویں سے ایک بوند پانی نہیں مل سکتا"

"کیوں؟"

"دیکھتے نہیں ہو ہم کنواں صاف کر رہے ہیں"

یکایک عین اسی وقت ایک غوطہ خور نے باہر نکل کر جال کو کنویں کے باہر الٹ دیا، جال سے بہت سا کیچڑ زمین پر بکھر گیا۔

اک دم بہت سے لوگ دوڑ پڑے اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کیچڑ میں کچھ ٹٹولنے لگے۔ مگر انہیں کیچڑ میں سے کچھ نہ ملا غوطہ خور نے خالی جال کو ہاتھ میں لے کر پھر کنویں میں چھلانگ لگادی۔

"یہ غوطہ خور کیا ڈھونڈ رہا ہے؟" میں نے بڈھے سے پوچھا۔

"کچھ ڈھونڈ نہیں رہا ہے" بڈھے نے جواب دیا۔

"یہ کنویں کا گندہ کیچڑ باہر نکال کر پھینک رہا ہے، جب سارا

کیچڑ باہر نکل آئے گا - تو یہ کنواں صاف ہو جائے گا - پھر تم اس کا پانی اپنے بچے کو پلا سکتے ہو ؟"

میں بچے کو لئے ہوئے کنارے پر کھڑا ہو گیا - غوطہ خور جال کو لئے ہوئے باہر نکلا - اُس نے کیچڑ زمین پر بکھیر دیا - کیچڑ میں سے ایک کنگھی نکلی -

غوطہ خور نے پوچھا یہ کنگھی کس کی ہے ؟

ایک نو بیاہتا لڑکی نے شرما کر غوطہ خور کے ہاتھ سے کنگھی لے لی - اور پھر اپنے شوہر کے کندھے پر جھک گئی - اُس لڑکی کے بال سنہرے اور لانبے تھے، چہرہ بیضوی اور گیہواں، آنکھیں بڑی بڑی اور بھوری، کبھی کبھی جب ان میں آنسو آ جاتے تو شفق کی طرح چمک اٹھتی تھیں -

" یاد ہے ؟" وہ اپنے شوہر سے آہستہ سے بولی - اور اُس کی انگلیاں دھیرے دھیرے کنگھی پر پھرنے لگیں جیسے کنگھی کا ہر دندانہ وقت کا ایک شیریں لمحہ ہو جو اب کبھی واپس نہیں آئے گا

" یاد ہے !" اس کے جوان شوہر نے آہستہ سے کہا، اور وہ خوابوں میں کھو گیا - اسی کنویں کے کنارے اُس نے اپنی سرمیلی کو پہلی بار دیکھا تھا - جب وہ غسل کرنے سے پہلے اپنے سنہرے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی اور وہ پیاسا تھا، اور اس نے اپنا گھوڑا اس کنویں پر روک کر اس سے پانی مانگا تھا -

پانی !

پانی میں بڑی طاقت ہے !

"پانی میں بڑی محبت ہے!"

جوان شوہر نے اپنی نوبیاہتا بیوی سے کنگھی لے کر اسے اپنے
ہونٹوں سے لگا لیا۔ پھر اُسے اپنی جیب میں رکھ لیا.... لڑکی نے
اسے پانی پلانے سے پہلے کنگھی کنویں کی جگت پر رکھ دی تھی، اُس کے
سنہرے بال اس کے شانوں پر بکھر گئے تھے۔ اور جب وہ پانی پلا کر
بکھر گئے تھے۔ اور جب وہ پانی پلا کر پلٹی تھی تو نوجوان نے اُس کا
ہاتھ پکڑ لیا تھا اور اسی کشمکش میں کنگھی اُچھل کر کنویں میں جا گری تھی۔

یاد ہے؟

کس کو یاد نہ ہوگا۔ ہاتھوں کا وہ پہلا لمس جب کنگھی پانی میں گر گئی
تھی۔ جب نگاہ دل میں اُتر گئی تھی۔

جب بالوں کی ہر کرن آفتاب بن گئی تھی! کسے یاد نہ ہوگا؟

غوطہ خور پھر باہر نکلا۔ باہر نکل کر پھر اس نے جال اُلٹ دیا۔
اب کے اُس میں سے ایک لمبی سی چھُری نکلی۔

سپید ریش بڈھے نے چھُری کو ہاتھ میں لے کر پوچھا "یہ چھُری
کس کی ہے؟"

چند لمحوں کے لئے اس مجمع میں سے کوئی نہ بولا۔ سب اس چھُری
کو جانتے تھے، اس چھُری کا دستہ ہاتھی دانت کا تھا اور بہت خوبصورت
تھا۔ یہ چھُری جس نوجوان کی تھی وہ بھی اس مجمع میں کھڑا تھا، اور سب لوگ
اُس کی طرف دیکھ رہے تھے، کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ اس نے اس
ظالم تھانیدار کو ختم کر دیا تھا جو اُن کے گاؤں کی بہو بیٹیوں کی عزت
کے درپے رہتا تھا۔ مگر نوجوان کے خلاف کوئی ثبوت نہ مل سکا تھا۔

اور پولیس کا مقدمہ خارج ہوگیا تھا اور جس نے گاؤں کی عزت لی تھی اس کا نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹ چکا تھا - پانی کی لہروں نے اس چھری کو اس طرح لوگوں کی نظروں سے پنہاں کردیا تھا - جس طرح ماں اپنے گناہ گار بیٹے کو اپنے دامن چھپا لیتی ہے -

" پانی میں بڑی طاقت ہے - !

پانی جو انتقام ہے !

اس نوجوان کی آنکھیں سرخ ہوگئیں ، یکایک اس نے آگے بڑھ کر بڑھے سپید ریش کے ہاتھ سے چھری اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے کمر بند میں اڑس لی اور فخر اور غرور سے اس کی ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا -

فوٹو گرافر پھر جال باہر لایا - اب کے سیاہ رنگ کے کیچڑ میں ہاتھی دانت کی بہت سی چوڑیاں تھیں -

گاؤں کی سب سے نوجوان بیوہ دھیرے دھیرے سسکنے لگی ، کیونکہ شادی کے روز اس کے دولہا نے اس لئے زہر کھایا تھا ، کیونکہ اسے کسی دوسرے گاؤں کی لڑکی سے محبت تھی ، وہ لڑکی جو کبھی اس کی نہ ہوسکی - سہاگ رات کو اپنے سامنے اپنے شوہر کی لاش دیکھ کر وہ پگلی اور شرمیلی چیخ کر باہر بھاگ گئی تھی اور اس نے اپنی ساری چوڑیاں اتار کر کنویں میں پھینک دی تھیں -

بڑھا خاموش کھڑا رہا . . . .

وہ نوجوان بیوہ دھیرے دھیرے آگے بڑھی اور جھک کر ایک ایک چوڑی کو بڑی احتیاط سے اپنے دامن میں سمیٹنے لگی جیسے وہ اپنی چوڑیاں

نہیں اپنی نادیدہ حسرتیں گن رہی ہو۔ سب چوڑیاں اٹھاکر اس نے
اپنے دامن میں ڈال لیں اور پھر سر جھکائے ہوئے وہاں سے چلی گئی
اس کے جانے کے بعد بھی دیر تک لوگ خاموش کھڑے رہے۔
بڈھے نے کہا "یہ ہمارے پرکھوں کا کنواں ہے۔ یہ ہمیں زندگی
بھی دیتا ہے اور موت بھی۔ اس کنویں سے کوئی نہیں بچ سکتا۔"
یکایک غوطہ خور پھر باہر نکلا۔ اب کے اس کا چہرہ مدھم پڑ گیا
تھا اور سینہ زور زور سے حرکت کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا
جیسے وہ بہت دور نیچے گہرے اتھاہ پانیوں سے کچھ ڈھونڈ کر لایا ہے۔
غوطہ خور نے بڑی احتیاط سے جال کو کھولا۔ اب کے جال میں
کیچڑ کم تھی۔ ریت زیادہ تھی اور اس ریت میں ایک ننھے بچے کی لاش تھی۔
یکایک سب لوگ دو قدم پیچھے ہٹ گئے اور غور سے اس بچے
کی لاش کو دیکھنے لگے۔ ان سب کی نگاہیں پھٹی پھٹی تھیں۔
سپید ریش بڈھے نے اس مردہ بچے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اوپر
اٹھالیا اور بولا۔

"یہ بچہ کس کا ہے؟"

کوئی نہیں بولا۔

کوئی آگے نہیں بڑھا۔

مردوں کے چہرے فق تھے۔ شادی شدہ عورتوں نے
گھونگھٹ کاڑھ لئے تھے۔ نوجوان کنواریوں کی نگاہیں نیچی تھیں۔
"یہ بچہ کس کا ہے؟" بڈھے سپید ریش نے درشت لہجے میں
پھر پوچھا۔

سب دم بخود چپ چاپ کنوئیں کے گرد حلقہ باندھے کھڑے تھے کسی نے کوئی جواب نہ دیا، کسی نے اس بچے کو اپنا نہ کہا۔

بڈھے نے مردہ بچے کو غوطہ خور کے حوالے کرتے ہوئے بڑے افسوس سے کہا :۔

"غوطہ خور اس بچے کو واپس کنوئیں میں ڈال دو "

"پھر وہ میری طرف تأسف آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

" اجنبی! مجھے بے حد افسوس ہے کہ اب یہ کنواں صاف نہ ہو سکے گا تم اپنے بچے کو اس کا پانی پلا کر اسے زندگی نہ دے سکو گے ۔۔۔۔؟

غوطہ خور نے مردہ بچے کو واپس کنوئیں میں ڈال دیا۔

یکایک میری گود سے میرا بچہ اچھل کر کنوئیں کی طرف چیختا بھاگا۔

"ٹھہرو! ٹھہرو! میں اس بچے سے کھیلوں گا ۔!"

اور پیشتر اس کے کہ میں آگے بڑھوں میرے بچے نے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی!

" میرا بچہ! میرا بچہ!" کہتے ہوئے آگے بڑھا۔ مگر گاؤں کے لوگوں نے مجھے روک دیا :۔

" دیکھتے نہیں ہو؟" میں نے چلا کر کہا " میرا بچہ اس کنوئیں میں گیا ہے !"

" وہ اس دوسرے بچے سے کھیل رہا ہے !" سپید ریش بڈھا آہستہ سے بولا۔

میں نے کنوئیں میں جھانک کر کہا " بیٹا۔ بیٹا۔ واپس آجاؤ "

کنوئیں سے ایک زہر خند ہنسی کی آواز آئی۔ جیسے کنوئیں میں پانی نہ ہو زہر کا جھاگ ہی جھاگ ہو۔ جو اس کنوئیں سے ابل کر ساری دنیا کی وادیوں، گھاٹیوں اور میدانوں میں پھیل رہا ہو!

لوگ مجھے وہاں سے کھینچ کر پرے لے گئے، میں نے دوزانو ہو کر بڈھے کے دامن کو پکڑ لیا اور گڑگڑا کر بولا۔

"میرا بچّہ بابا! میرا بچّہ۔ مجھے واپس دیدو۔ میں خود چل کے تیرے کنوئیں کے پاس آیا ہوں۔ میرا بچّہ مجھے واپس مل جائے گا۔!"

"مل جائے گا!" بابا سیدھا تن کر کھڑا ہو گیا، اور اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی روشنی آ گئی۔ دھیرے دھیرے لیکن بڑی مضبوطی سے۔ وہ بولا "تیرا بچّہ تجھے واپس مل جائے گا۔ لیکن اسی وقت جب کوئی کنواری اس کنوئیں پر آئے گی اور اس کنوئیں کی جگت پر جھک کر اس دوسرے بچّے کو آواز دے گی اور اسے اپنا بیٹا کہہ کر پکارے گی، اسی لمحے تمہیں تمہارا بچّہ مل جائے گا۔

" میں وہاں سے اٹھا اور گاؤں کی عورتوں کے پاس گیا

"میرا بچّہ مجھے دیدو!"

شادی شدہ عورتوں نے اپنے گھونگھٹ لمبے کر لئے اور میری طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہو گئیں۔

"میرا بچّہ مجھے دیدو"

کنواریوں نے اپنے منہ پھیر لئے، ان کے ہونٹ زرد تھے اور پلکیں آنسوؤں سے لرزتی ہوئیں۔

"میرا بچّہ مجھے دیدو"

" بڈھی عورتیں حقارت سے قہقہہ مار کر ہنس پڑیں۔ وہ حقارت سے ہنس سکتی تھیں۔ کیونکہ ان کی کوکھ اندھی ہو چکی تھی۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ تاکہ وہ لوگ میرے

رخساروں پر میرے گرتے ہوئے آنسو نہ دیکھ سکیں۔

بہت دیر کے بعد جب میں نے اپنے چہرے سے اپنے ہاتھ ہٹا لئے۔ تو وہاں کوئی نہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں اس گاؤں میں اکیلا ہوں۔ جو کہیں نہیں ہے۔ اُس کنوئیں کے کنارے کھڑا ہوں جو ہر جگہ رہتا ہے پر ہے، اور اُس کنواری کا انتظار کر رہا ہوں جو ایک دن میرے بچے کی جان بچانے کے لئے اس کنوئیں پر آئے گی



موہنجوداروکاخزانہ

موہنجوداروکے سب ٹیلے کھودے جاچکے تھے سوائے ایک کے
موہنجوداروکے ٹیلوں کا سینہ چیر کے انسانی ہاتھوں نے پانچ ہزار سال پرانی
تہذیب کے سارے عناصر سمیٹ لیئے تھے -
کتنے صراحیاں، کھلونے، جام، چکیاں، اصطبل، فصلیں، حصار، گودام، غلام
گردشیں (غلام ہمیشہ گردش میں رہتے ہیں، آج بھی آج سے پانچ ہزار سال
پہلے بھی) کپڑا، رنگ، ظروف، مٹی کے تابوت، وزن کے سیر، پاؤ
چھٹانک، کھودنے والوں نے سب کچھ نکال لیا تھا مگر جو وہ چاہتے تھے وہ انہیں
نہیں ملا ——
کھودنے میں کامیابی یا ناکامی دونوں ممکن ہیں - زمین کھودنے پر اپنے سارے
خزانے اگل دیتی ہے - لیکن کبھی بھی انسان اپنی خواہشوں کو اسیں سے کھودتا
ہے اور ناکام رہتا ہے، اور پھر زمین کو گالی دیتا ہے انہیں زمین کا کیا قصور؟
یوں تو زمین نے انسان کی ہر خواہش کو پورا کیا ہے لیکن اپنے طریقے سے -
کیونکہ زمین ایک عشوہ طراز محبوبہ ہے! لیکن بہت سے لوگ اسے ایک مٹی
سمجھتے ہیں!! اور اس طرح اپنی خواہشوں کو مٹی میں ملا دیتے ہیں!!!

انجنیروں اور محکمۂ آثار قدیمہ کے ماہروں کی کانفرنس جاری تھی، ایک گنجے سر والا یوروپین تھا۔ ڈیوڈ، یوروپین اور نیلا اسفر اور یہودی، دوسرا سانولے رنگ کا دُبلا پتلا مسلمان تھا۔ اطہر۔ اسے ہر وقت مٹّی کے کتبے جمع کرنے کا شوق تھا۔ اگر مٹّی کے ڈھیر سے نکالتے وقت کوئی کتبہ یا حروف کی مہر یا اینٹ بیچ میں سے ٹوٹ جاتی تو وہ ایسے آبدیدہ ہو جاتا جیسے کسی نے اس کے دل پر پاؤں رکھ دیا ہو

تیسرا موجمدار ایک بنگالی ہندو تھا، سیاہ فام اور کوتاہ قد لیکن اپنے ذہن میں علم و فضل کے سمندر سمیٹے ہوئے تھا۔ مصر کا آخری اہرام اس کے سامنے ہی کھولا گیا تھا، فرات کی وادیوں میں تینوں کی ملکہ کا تابوت اسی نے دریافت کیا تھا۔

چوتھا میں تھا جو ماضی کا پچھتاوا ہوں اور مستقبل کی بازگشت لیکن وہ مجھے صرف سن سکتے تھے دیکھ نہیں سکتے تھے!

موجمدار نے کہا۔ اب صرف آخری ٹیلہ رہ گیا ہے کھودنے کے لئے لیکن سمجھ میں نہیں آتا اتنے بڑے شہر کے خزانے کو کیا ہوا۔ عورتوں کے سونے کے زیور تو کہیں کہیں ملے ہیں مگر بے حد معمولی ان میں سے کسی میں ہیرے جواہرات بھی ٹنکے ہوئے ہیں لیکن بے حد معمولی اور چھوٹے اور گھٹیا قسم کے اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سونا دریافت ہو چکا تھا اور ہیرے اور جواہرات بھی، پھر شہر کا خزانہ کہاں گیا۔؟

میں نے کہا۔ ہو سکتا ہے۔ اپنے وقت کا کوئی نادر شاہ اس زمانے میں بھی رہا ہو وہ اس شہر کے سارے خزانے لوٹ کر چلتا بنا ہو!

لیکن ان لوگوں نے میری بات کی پروا نہ کی۔ اطہر نے کہا، لاتعداد ان گنت کتبے ہیں کس ٹیلے پر سے وہ قبر نہیں ملی۔ جو موہنجوداڑو کی زبان کی کلید

ثابت ہوتی...... اُس کلیر کے دریافت نہ ہونے سے ہماری تہذیب دُنیا کی سب سے پُرانی زبان کے بیش قیمت ورثے سے محروم ہو جائے گی ۔؟

میں نے کہا" مردہ زبانوں کے ڈھونڈنے والے آج تیرے سامنے جو زندہ زبانوں کو قتل کیا جا رہا ہے اُس کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟

لیکن اطہر نے اس طرح اپنا کندھا ہلایا جیسے اس نے میری بات ہی نہ سُنی ہو۔

ڈیوڈ بولا" خزانہ نہ ملے مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے، آخر کونسا یہ خزانہ ہم اپنے گھر لے جا سکیں گے، زبان کی کنجی بھی نہیں ملتی نہ ملے، آخر یہ زبان آجکل کے زمانے کے کس کام آتی ؟ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے ٹیلے ہم نے کھود ڈالے، سارے موہنجوداڑو کی بنیادیں تک ہم نے ہلا دیں، ہمیں آج تک وہ مٹی کا خزانہ نہ ملا جسے وہ لوگ پوجتے تھے، ہر تہذیب کے لئے کسی نہ کسی خدا کا تصوّر ضروری ہوتا ہے۔ موہنجوداڑو کے لوگ کس خدا کو پوجتے تھے یہ راز کسی ٹیلے کو کھودنے سے ہم پر ظاہر نہ ہوا؟

میں نے کہا" شاید اُس راز کو ڈھونڈنے کے لئے تمہیں کسی ٹیلے کو کھودنے کی ضرورت نہ تھی ذرا سا اپنے دل کو کھود لیتے!

ڈیوڈ نے غصّہ سے سامنے کی دیوار کی طرف دیکھا، جہاں اُس کے خیال میں میں مکڑی کے جالے میں لٹکا ہوا تھا۔ پھر اُس نے کھڑکی سے باہر نگاہ ڈالی۔ باہر ایک نیم ریتیلے میدان میں ایک بوڑھا گڈریا بھیڑیں چرا رہا تھا۔

ڈیوڈ نے کہا" ایک روز یہ بوڑھا گڈریا مجھ سے کہتا تھا۔ کہ موہنجوداڑو کا سب سے بیش قیمت راز اس بڑے ٹیلے میں دفن ہے۔

میں نے پوچھا "، اس ٹیلے میں جواب تک کھودا نہیں گیا؟

کسی نے میری بات کا جواب نہیں دیا سب اپنے اپنے خوابوں میں کھوئے ہوئے تھے۔

ڈیوڈ نے کہا "کل رات کو ہم تینوں مِل کر موہنجو داڑو کے آخری ٹیلے کو کھودیں گے۔ اُس میں سے ...."

اطہر بولا "شاید موہنجو داڑو کی زبان کی کُنجی مِل جائے"

موجمدار بولا "شاید موہنجو داڑو کا خزانہ مِل جائے"

ڈیوڈ بولا "شاید موہنجو داڑو کا خدا مِل جائے!"

رات کے تیسرے پہر تک وہ لوگ، وہ تینوں مِل کر زمین کھودتے رہے، زمین بھُربھُری اور ریتیلی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جتنا اونچا ٹیلہ ہوتا ہے اُتنا ہی بھُس بھرا ہوتا ہے، کیونکہ اب تک اس ٹیلے میں سے کام کی کوئی چیز نہ نکلی تھی۔ مٹی کا ایک کتبہ، بچوں کا ایک کھلونا، عورتوں کا ایک زیور موت کا ایک تابوت کچھ بھی تو اس ٹیلے میں سے نہ نکلا، بس ریت ہی ریت تھی۔

"یہ گنڈر باکو اس کرنا تھا۔" ڈیوڈ نے جھلّا کر کہا۔

موجمدار نے کہا "قیمتی چیز سب سے آخر میں ملتی ہے، یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ سب سے بیش قیمت شئے سب سے محفوظ جگہ چھُپا کے رکھتا ہے۔"

"اب ہم ٹیلے کے آخر تک آن پہنچے ہیں۔"

اطہر نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھ کر سیدھی کرتے ہوئے کہا "مگر اب تک ریت کے سوا اس میں کچھ نہیں مِلا۔" اُس کے لہجے میں گہری مایوسی تھی۔

میں نے کہا "مگر اس پانچ ہزار برس پُرانی ریت کو تو دیکھو اس کے ذرّے ذرّے میں پُرانی کہانیوں کی مہک ہے.... اس ریت سے کانچ کی چوڑی بنی تھی جسے موہنجو داڑو کی عورت نے اپنی نازک کلائی میں پہنا تھا۔ اس ریت میں موہنجو داڑو کے بچّوں نے مٹی کے گھروندے بنائے تھے، اس ریت میں آج

سے پانچ ہزار برس پہلے کسی عاشق کا تابوت گاڑا گیا تھا۔۔۔۔ ذرا سونگھو تو اس ریت کو، سنو یہ پانچ ہزار برس پرانی ریت کیا کہتی ہے، کیا کیا سناتی ہے، کیس کیس طرح فریاد کرتی ہے بیٹے"

عین اسی وقت موچیدار کی کدال دھات کے کسی برتن سے ٹکرائی اور موچیدار کدال چھوڑ وہیں دھم سے بیٹھ گیا، اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

سنبھال کے سنبھال کے۔۔۔ ڈیوڈ نے اسے تہدیدی انداز میں کہا اور خود بھی موچیدار کے قریب بیٹھ گیا۔

تیسری طرف سے اطہر بھی آکے ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

چوتھی طرف سے گیس لیمپ کی اجلی اجلی روشنی آرہی تھی۔

ان تینوں نے ہاتھوں سے بلکہ ناخنوں سے کرید کرید کر دھات کے اس برتن کو نکالا۔ ڈیوڈ نے جھاڑ پونچھ کر اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر گیس کی روشنی میں دیکھا۔

موچیدار خوشی سے چلا کر بولا "یہ تو سونے کی صندوقچی ہے!"

واقعی یہ ایک سونے کی خوبصورت صندوقچی تھی۔ جس پر خوبصورت نقش ونگار بنے ہوئے تھے اور موہنجو دارو کی قدیم زبان کے حروف کندہ تھے اور عجیب وغریب دیوی دیوتاؤں کی تصویریں کھدی تھیں۔

موچیدار نے چلا کے کہا "یہی وہ ہے موہنجو دارو کے شہر کا بیش قیمت خزانہ یاقوت، نیلم، لعل و مرجان سے بھرا ہوا"

اطہر بولا "نہیں۔ اس میں موہنجو دارو کی زبان کی کنجی ہے، یہ باہر کے کندہ کئے ہوئے حروف تو دیکھو"

ڈیوڈ بولا "نہیں موہنجو دارو کا خدا ہے۔ دیوی دیوتاؤں کی عجیب وغریب اس مقدس صندوقچی کی حفاظت کر رہے ہیں۔ یہ دیکھو۔۔۔۔"

"کھولو۔ کھولو۔ موحمدار نے بڑی بے تابی سے کہا، اس صندوقچی کو جلدی سے کھولو۔"
صندوقچی میں بھی سونے کا تالا لگا ہوا تھا، لیکن ڈیوڈ کو تالا کھولنے میں زیادہ دقت پیش نہیں، محکمہ آثار قدیمہ کے ماہروں اور نقب زنوں میں زیادہ فرق نہیں ہوتا، تکنیک کے اعتبار سے دونوں میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے، اس لئے تالا بہت جلدی کھول لیا گیا۔
لیکن ڈیوڈ کا دل ڈھکنا کھولنے سے ہچکچا رہا تھا، ان آخری لمحوں میں ہمیشہ یونہی ہوتا ہے اور بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے گویا تھیٹر کا پہلا پردہ اُٹھنے والا ہو۔
موحمدار نے کہا "ڈھکنا اٹھاؤ۔ ڈیوڈ۔ جلدی سے ڈھکنا اٹھاؤ۔"
ڈیوڈ پھر ہچکچایا۔
اطہر نے آگے بڑھ کے صندوقچی کا ڈھکنا اُٹھا دیا۔
"خدا کے لئے ڈیوڈ"
اندر ایک گول گول سیاہ سی چیز پڑی تھی، ڈیوڈ نے اسے بڑی احتیاط سے اُٹھایا، سونگھا اور بڑی مایوسی سے کہا "یہ تو ایک روٹی ہے!"
"روٹی؟" موحمدار مایوسی سے چلایا۔
میں نے کہا، "ہاں روٹی! دنیا کا سب سے بیش قیمت خزانہ"
اطہر نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا، "روٹی؟"
میں نے کہا "روٹی! جو ہر زبان کی کنجی ہے۔"
ڈیوڈ کا سر ناامیدی سے اپنے سینے پر جھک گیا، وہ آہستہ سے بولا "صرف ایک روٹی؟"
میں نے کہا "روٹی! جو ساری تہذیبوں کا خدا ہے!"

لیکن اُمید و بیم کی پہلی کشمکش میں انہیں میری بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ان تینوں نے باری باری سے اس روٹی کو اٹھا کر دیکھا۔ ہاں روٹی تھی۔ اناج کی روٹی تھی، اور صرف ایک روٹی تھی۔

ڈیوڈ نے اس روٹی کو ہاتھ میں لیا۔ اور غصّے سے بولا۔

"کدھر ہے وہ گڈریا۔ جو کہتا تھا۔ موہنجو دارو کے آخری ٹیلے میں اس کا سب سے بیش قیمت خزانہ دفن ہے" تینوں نے مل کر اس سمت دیکھا جدھر گڈریا بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ گڈریا مسکرا رہا ہے۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ رو رہا ہو! اس روٹی کو جو انسان کی پہلی خوشی ہے، اور آخری غم ہے، پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے جہاں پر گڈریا تھا وہاں پر اب ایک صلیب ہے! پھر یکا یک صلیب کے پیچھے سے آفتاب نکل آیا اور اس کی سنہری کرنوں میں وہ روٹی یکا یک ایک سونے کی تھال کی طرح چمک اٹھی اور یکا یک ان تینوں کی سمجھ میں کچھ آ گیا اور موجمدار نے ڈیوڈ سے اشارہ کر کے کہا۔ اس روٹی کو چھپا لو، اس روٹی کو چھپا لو، مزدور کام پر واپس آ رہے ہیں۔

ڈیوڈ نے گھبرا کر روٹی کو جلدی سے اپنے دامن میں چھپا لیا اور اُفق کی طرف دیکھا، اُفق پر واقعی صبح ہو چکی تھی اور مزدور کدالیں اُٹھائے کام پر واپس آ رہے تھے۔

ختم شد۔

کرشن چندر

4-3-60

دستکاری۔ ڈاکٹری طبی و مختلف ہنروں کی بے نظیر اردو کتابیں

— مشورہ بک ڈپو کے بڑے سائز 20x30/16 پر چھپی ہوئی کتابیں —

انگریزی ہندی بولنا سکھانے والی کتابیں

اردو سے انگریزی خط و کتابت	4/-
اردو انگریزی گرامر	4/-
فٹافٹ انگریزی بولنا سیکھو	4/-
اردو انگلش ٹیچر	4/-
سات روپے میں میٹرک پاس	7/-
اردو ہندی ٹیچر	3/-

ایلوپیتھک ڈاکٹری کتب (اردو میں)

ایلوپیتھک پریکٹس آف میڈیسن	7/50
ایلوپیتھک میٹریا میڈیکا	7/50
ایلوپیتھک انجکشن بک	7/75
ایلوپیتھک کمپونڈر گائیڈ	7/50
آئی ڈاکٹر	4/-
بلڈ پریشر	3/25
ایلوپیتھک مائنر سرجری	6/-

ایلوپیتھک میڈیکل ڈکشنری	4/50
دندان سازی	5/-
پیٹنٹ ادویات	4/-
سلفا ڈرگز	3/25
وٹامن گائیڈ	4/-
اسٹیتھسکوپ گائیڈ	3/-
پینسلین گائیڈ	4/25
بخار و تھرمامیٹر	2/75
ایلوپیتھک لیڈی ڈاکٹر	5/75

علم موسیقی کی کتابیں!

ہارمونیم گائیڈ	4/-
بینجو عرف جاپانی باجا بجانا	3/-
بانسری گائیڈ	3/-
وائلن گائیڈ	3/-

(ہر کتاب کا محصول ڈاک الگ ہوگا)

منگانے کا پتہ — مشورہ بک ڈپو۔ رام نگر گاندھی نگر پوسٹ بکس 1639 دہلی

دستکاری، ڈاکٹری، طبی و مختلف ہنروں کی بے نظیر اردو کتابیں

مشورہ بک ڈپو کی بڑے سائز 20×30/16 پر چھپی ہوئی کتابیں

دیسی انگریزی صابن بنانا — لانڈری ڈرائی کلیننگ

بن بجلی کا ریڈیو بنانا — رہنمائے شاعری و فسانہ نویسی

اچار مربے چٹنی بنانا — گھڑی سازی

خوشبودار تیل و عطر بنانا — تاش کے عجیب و غریب کھیل

آئینہ سازی (شیشہ دیکھنے کے شیشے بنانا) — کپڑے چھاپنے و رنگنے کا ہنر

خوشبودار صابن اگربتی — رنگ برنگی آتش بازی

بیکری (کیک بسکٹ بنانا) تل کا تیل — راز روزگار

کٹائی سلائی سکھشا — بلاک بنانے کا کام

نیو فیشن بک — مصوری و سائن بورڈ پینٹنگ

موم بتیاں بنانا — پان کے خوش ذائقہ مصالحے بنانا

سوڈا لیمن شربت بنانا — بوٹ پالش بنانا

تمباکو اور اس کے مرکبات — گورے اور خوبصورت بننے کا راز

بنگالی و انگریزی مٹھائیاں بنانا — چمڑے کا کام

روشنائی سازی — باورچی خانہ

کتھہ سازی — رنگ وارنش

ہر کتاب کا محصول ڈاک الگ ہوگا۔

مشورہ بکڈپو۔ رام نگر گاندھی نگر پوسٹ بکس ۱۶۳۹ دہلی



مشورہ بکس

مسکرانے والیاں (افسانے) کرشن چندر — منحوس ستارہ (جاسوسی ناول) اکرم الہ آبادی

چندن ہار (ناول) عادل رشید — ہیملیٹ (خون کا خون) (ڈرامہ) شکسپیر

ابوالہول کی روح (جاسوسی ناول) اکرم الہ آبادی — منٹو کے افسانے (افسانے) سعادت حسن منٹو

میرے صنم (ناول) زلیخا حسین — بال جبریل (شاعری) اقبال

پراج بہو (ناول) شرت چندر — کرشن چندر کے افسانے (افسانے) کرشن چندر

رومیو جیولٹ (ڈرامہ) شکسپیر — کلام میر تقی میر (شاعری) میر تقی

عمر خیام کی رباعیات (شاعری) پنڈت بیرنا تقف — دیوان ظفر (شاعری) ظفر

دیوان غالب (شاعری) مرزا غالب — کلام حالی (شاعری) حالی

منٹو اور فلمی شخصیتیں (فلمی دنیا کے سچے حالات) منٹو — خود تشخیص کیا جا سکتا ہے - خواجہ احمد عباس

بانگ درا (شاعری) علامہ اقبال — صحت و تندرستی ڈاکٹر وشنو داس بخشی

غدار (ناول) کرشن چندر — لکشمی (ناول) کرشن گوپال

بڑی دیدی (ناول) شرت چندر — اداس تنہائیاں (ناول) ٹھاکر پونچھی

کشور (ناول) نسیم انہونوی — انجانے راستے (ناول) وحشی محمود آبادی

چندر مال (ناول) عادل رشید — وادی نور (جاسوسی ناول) اکرم الہ آبادی

پوجا (ناول) کرشن گوپال عابد — نشیمن (ناول) عابد حجاب لکھنوی

گمراہ (ناول) حفیظ ہاشمی — قیمت فی کتاب ایک روپیہ ۱/-/۱

ایک ہنسی ہزار آنسو (ناول) کرشن گوپال عابد

مشورہ بک ڈپو پوسٹ بکس 1639 رام نگر گاندھی نگر دہلی

